اقبالیاتِ باقی

اقبال
پر
تحریریں

عبدالقیوم خاں باقی مرحوم
استاد شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ

مرتب: مصلح الدین سعدی

ناشر: اقبال اکیڈمی، مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹ (اے، پی) انڈیا

اقبالیات باقی

اقبالیات پر تحریریں

○

جناب عبدالقیوم خاں باقی مرحوم

استاد شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ

○

مُرتبہ

مصلح الدّین سعدی

○

شائع کردہ

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد مدینہ مینشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹ (آندھرا پردیش)

ACC. NO -

ناشر : اقبال اکیڈمی، حیدرآباد

اشاعت : ______ مارچ ۱۹۸۰ء

قیمت : ______ دس روپے

باعانت : ______ اقبال اکیڈمی پربھنی مہاراشٹرا

طباعت : تاج پریس، یوسف بازار، حیدرآباد

جلد بندی : حفیظیہ بک بائنڈنگ، یوسف بازار حیدرآباد

کتابت

قاری محمد غالبؔ

ابتدائی صفحات و سرورق : ______ سلام خوشنویس

ملنے کا پتہ

اقبال اکیڈمی حیدرآباد مدینہ منشن، نارائن گوڑہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۲۹

اِقبالیاتِ باقی

مُندرجات

حرفِ اوّل _____

باقی اور اقبالیاتِ باقی _____ مصلح الدین سعدیؒ _____ ۳

اقبالیاتِ باقی _____

اقبال کا خیال اور اُس کا حُسن و جمال _____ ۹

اقبال کا فلسفہ _____ ۲۳

اقبال کے الہامی تصورات _____ ۳۳

مطالعۂ اقبال غلط زاویۂ نگاہ سے _____ ۴۵

غنائیہ ___ اقبال _____ ۵۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باقیؔ اور اقبالیاتِ باقیؔ

عبدالقیوم خاں باقیؔ مادرِ علمی جامعہ عثمانیہ کے ان ہونہار اور لائق فرزندوں میں سے ایک تھے جنھوں نے مادرِ علمی سے فیض حاصل کیا اور تادمِ زیست اپنے خونِ جگر سے اس کشتِ علم کی نئی فصلوں کو سیراب بھی کیا۔ فنونِ لطیفہ کے مختلف شعبوں میں انھیں خصوصی دلچسپی تھی۔ اقبال بھی ان کے مطالعہ کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔

سرزمینِ دکن سے اقبال کا تعلق ان کی یورپ کی روانگی سے بہت پہلے سنہ ۱۹۰۱ء میں ہی پیدا ہو چکا تھا۔ استاد داغ سے تلمذ اور داغ کے دوسرے شاگردوں سے ان کی خط و کتابت ریکارڈ پر موجود ہے۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں اقبال عطیہ بیگم کا تعارفی خط لیے حیدرآباد آئے اور یہاں سر اکبر حیدری کے مہمان ہوئے۔ اس سفر کے دوران اقبال نہ صرف حیدرآباد کے علمی حلقوں میں متعارف ہوئے بلکہ ان تعلقات کی بنیاد بھی پڑ گئی جو آگے چل کر اقبال کی زندگی میں کافی اہمیت کے حامل ہیں اس سلسلہ میں خصوصاً مہاراجہ سرکشن پرشاد سے اقبال کی خط و کتابت ہنوز محققین کو دعوتِ شوق دے رہی ہے۔ بہت سارے مسائل اور بہت سارا مواد جس کا تو تجزیے اور حواشی کا منتظر ہے، اقبال کی ابتدائی زندگی کے بہت سارے نئے گوشے اس مطالعہ کے نتیجے کے طور پر شاید ہمارے سامنے ابھر کر آجائیں

حیدرآباد میں اقبال کی زندگی ہی میں ان کے پیام اور کلام کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ مختلف نقاطِ نظر کے حامل دانشور اور مفکر اقبال شناسی اور اقبال فہمی کی سمت اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر سید عبداللطیف، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ابوظفر عبدالواحد

ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، پروفیسر ظہیر الدین احمد الجامعی، اشفاق حسین، ڈاکٹر رضی الدین، پروفیسر عزیز احمد کے علمی کارنامے نہ صرف یہ کہ حیدرآباد میں انجام پائے بلکہ اقبالیات کے اولین مطالعوں میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ باقی مرحوم کا تعلق بھی اسی دور کے اہل قلم سے تھا۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے "اقبال اور شاد" مرتب کی اور جدید شاعری میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے اقبال کے فکر و فن پر بسیط مقالہ لکھا۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اقبالیات پر مضمون کا درجہ رکھنے والی کئی ایک اہم شخصیتیں آج بھی حیدرآباد میں موجود ہیں جن کے چراغ علم سے اک جہاں اللہ روشن ہے۔ علمی سطح پر مطالعہ اقبال کے ساتھ ساتھ اقبال شناسی اور اقبال فہمی کی ایسی فضا پیدا ہو چلی تھی کہ اس ذوق کا اثر عوام کی زندگی پر بھی بڑا دور رس ہوا۔ قائد ملت نواب بہادر یار جنگ نے فکر اقبال اور پیام اقبال کو روشناس کرانے کے لیے اپنی خطابت کو استعمال کیا۔ اس بے بدل خطیب کی فکر اور حکمت عملی میں اقبال کے فکر کی اتنی گہری چھاپ ہے کہ بعض لوگوں نے اقبال کے تصور مرد مومن کی پرچھائیاں ان کی ذات میں جلوہ گر دیکھی ہیں۔ قائد ملت پیام اقبال کی تعبیر اور اس کے عملی انطباق کے سلسلے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ جن نوجوانوں نے اس وقت اس پیام کی اہمیت کو سمجھا اور ہندوستان میں اس پیام کو انسانیت کے لیے ضروری سمجھا اس میں مجلس تعمیر ملت کے صدر جناب سید خلیل اللہ حسینی کا نام قابل ذکر ہے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ پیام اقبال کی ترسیل و اشاعت کی کوشش اپنی شعلہ نوائی کے ذریعہ کی بلکہ نوجوانوں میں ایک اسپرٹ پیدا کر دی کہ وہ اقبالیات کی طرف متوجہ ہوں اور عصر حاضر کی دانش و بینش کا جائزہ پیام اقبال کی روشنی میں لیں۔ علمی سطح پر اقبال اکیڈیمی کا قیام بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ پیام اقبال سے ان کی والہانہ شیفتگی اپنی جگہ اس کے ساتھ ساتھ اقبال شناسی کی طرف ان کی مساعی اقبالیات میں اس لیے یادگار ہے کہ مختلف نقاط نظر رکھنے والے اقبال دوست اقبال اکیڈیمی میں جمع ہیں، جہاں معروضی انداز میں علمی سطح پر بھی کشادہ قلبی کے ساتھ اقبال کے فکر و فن پر اظہار خیال کے مواقع موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اکیڈیمی برصغیر ہند و پاک میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے۔ جو ساری دنیا کے اقبال دوستوں کو اپنی طرف متوجہ کیے ہوئے ہے

حیدرآباد میں مطالعہ اقبال کی روایت اور اس کے تسلسل کا ایک سرسری خاکہ آپ کے سامنے اس لیے پیش کیا گیا کہ عبدالقیوم خاں نہ صرف یہ کہ اس روایت سے مربوط تھے بلکہ اس ایک روایت کو مضبوط کرنے والی ایک اہم کڑی بھی تھے۔ وہ حیدرآباد کے اسی پس منظر سے ابھرے تھے۔ ان کے اجداد دہلی سے کرنول منتقل ہو گئے تھے۔ باقی کے والد محمد احمد خاں کرنول میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت حیدرآباد

میں ہوئی۔ انھوں نے وکالت کا امتحان بھی کامیاب کیا تھا۔ ایک عرصہ تک وکالت کرتے رہے۔ والیٔ دکن نواب میر عثمان علی خاں سے ان کا قریبی تعلق پیدا ہوا تو ان کی قدر دانی ہوئی۔ نواب احمد نواز جنگ کے خطاب سے مفتخر ہوئے۔ اور انہیں معتمد کمیٹی صرف خاص مقرر کیا گیا۔ باقی کے نانا میر امیر علی پریذیڈنٹ حیدرآباد کے میر منشی تھے۔ اور انگریزوں سے قریبی تعلقات رکھتے تھے۔

عبدالقیوم خاں باقی ۲۰ ستمبر ۱۹۰۸ء کو شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ فارسی عربی کی تعلیم اپنے نانا مولوی امیر علی سے حاصل کی۔ چادر گھاٹ ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ انٹرمیڈیٹ نظام کالج سے کیا۔ بی اے اور ایم۔ اے کی تکمیل جامعہ عثمانیہ سے کی۔ ۱۹۲۹ء میں محلۂ عثمانیہ کے حصہ انگریزی کے مدیر رہے۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی انہیں شاعری کا شوق تھا۔ مسرت منزل کے اقامت خانہ میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں پہلی بار نظم سنائی اور اہل علم کی نگاہوں میں مقام بنا لیا۔ بقول سروری صاحب باقی نے اس مشاعرہ میں اپنے تخیل اور فن کی خوب داد پائی۔ باقی ڈاکٹر سید عبداللطیف کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ باقی صاحب کے تذکرہ پر ڈاکٹر لطیف کی آنکھیں پرآب ہو جایا کرتی تھیں۔ باقی حیدرآباد کی علمی اور ادبی زندگی میں اپنی سرگرمیوں کے ذریعہ جان ڈال دیا کرتے تھے۔ اپنی رہائش گاہ کا نام "خانقاہ ادب" رکھا تھا۔ ستار نوازی میں انہیں کمال حاصل تھا۔ پینٹنگ کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں آج بھی کئی دیوان خانوں کی زینت ہیں۔ وہ ایک اچھے مصور ہی نہیں تھے بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجہ آرٹ کریٹک بھی تھے۔ ۲ دسمبر ۱۹۵۳ء کو حیدرآباد میں انتقال کر گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۵ یا ۴۶ سال کی تھی۔ احاطۂ درگاہ حضرت سردار بیگ میں مدفون ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ باقی اپنے زمانے کے تمام مشہور اور مستند علمی رسالوں میں چھپتے رہے۔ لیکن کوئی مجموعۂ نظم و نثر کا شائع نہیں ہوا۔ ان کی ساری کاوشیں بکھری پڑی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے ایک طالب علم مخدوم علی صابر نے ۱۹۷۰ء میں اپنے ایم اے کے امتحان کے لیے ان پر مقالہ پیش کیا۔ یہ کام ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبہ کی نگرانی میں انجام پایا۔ باقی نے فاوسٹ کا ترجمہ بھی کیا تھا جو پاکستان سے شائع ہو گیا ہے ـــــ جمالیات پر تحقیق کر رہے تھے۔ معلوم نہیں

لہ "راہرو اور کاروان" مرتبہ ڈاکٹر حفیظ قتیل بحوالہ مقالہ "عبدالقیوم خاں باقی حیات اور کارنامے از مخدوم علی صابر" جامعہ عثمانیہ لائبریری۔

۲ بحوالہ مقالہ مخدوم علی صابر مکتوب پروفیسر عبدالقادر سروری بنام مخدوم علی صابر

یہ کام کہاں اور کس حالت میں ہے۔

"اقبالیات باقی" عبدالقیوم خاں باقی کے انہی لکھے مضامین کا انتخاب ہے اقبالیات میں باقی کے مقام کا اندازہ ان مضامین سے ہو جائے گا۔ ان مضامین کے مطالعہ کے وقت یہ امر بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جس وقت یہ مضامین لکھے گئے اس وقت اقبال کے خلاف نقادوں کا ایک گروپ مستقلاً اقبال ناشناسی کا ثبوت دے رہا تھا۔ مخالف اقبال ماحول میں جو توازن اور اعتدال کی کیفیت آج ملتی ہے اس کو پیدا کرنے میں ان مضامین کا بھی ایک حصہ ہے۔ ہماری ادبی تاریخ میں ان مضامین کی یقیناً اہمیت ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ادبی مورخ اس کے ساتھ انصاف کرے گا یا نہیں۔

اقبالیات باقی میں ان کے تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں اور ایک تخلیقی شاہکار "عنائیہ اقبال" بھی۔ باقی صاحب بنیادی طور پر ادب میں جمالیاتی قدروں کے قایل تھے۔ مشرقی ادب، مغربی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ فلسفہ جمال ان کے ہاں تخلیقی اظہار کی بنیاد ہے۔ وہ تنقید اقبال کے چند نظریات کا تعین کرتے ہیں۔ یہ نظریات تنقیدی اعتبار سے اردو میں یوں اہم ہو جاتے ہیں کہ اقبال شناسی کے لیے کسی سکہ بند اصول کے بجائے خود فکر اقبال کے احاطہ کے لیے ایک نیا انداز نقد اختیار کیا گیا ہے۔ اقبال کی فکر و فن کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کے بجائے اقبال کی شخصیت کے اندر جھانکنے اور اس فنکار کو سمجھنے کی کوشش ملتی ہے جو شاعر اقبال میں چھپا ہوا تھا۔ خارجی ماحول سے نہ تو تعارض ہے اور نہ داخلیت پر اس قدر اصرار ہے کہ شاعر اپنی سماجی شناخت سے محروم ہو جائے۔

اقبال کے طالب علموں، نقادوں کو مطالعہ اقبال میں جو الجھنیں پیش آسکتی ہیں۔ اقبال کی نظر میں حسب ذیل ہیں:

۱۔ اقبال پر وضاحت نظر اور سکون دماغ کے ساتھ غور نہیں کرتے بلکہ بے دھڑک ایک سمندر میں کود پڑتے ہیں۔ جس میں کودنے کے بعد باہر نکل آنے کا راستہ نہیں ملتا اور انہیں سوائے ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنے کے کوئی چارہ نہیں ہوتا

۲۔ اقبال جیسے مفکر اور شاعر پر اس کے علمی معیار اور بلند مقام کا صحیح اندازہ کیے بغیر رائے زنی کی جاتی ہے حالانکہ اس ذی علم اور ذی ہوش انسان کے فکر و نظر پر اسی وقت بحث ہو سکتی ہے جبکہ اس کے متعلقہ علوم پر نقاد کو بھی دستگاہ ہو۔

۳۔ اقبال کے فلسفے یا پیغام کا بہ حیثیت مجموعی کم اندازہ کیا جاتا ہے اور تجزیہ زیادہ نفسیات

ادبی تنقید کے اعلیٰ اصول اور جمالیات جیسے علوم سے ہٹ کر تحقیقات کی بنیاد متفرق تجزیئے یا تقابل پر رکھی جاتی ہے حالانکہ تجزیہ سے زیادہ ربط Synthesis کی ضرورت ہے۔ اس انداز کی بحثوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک بڑے شاعر کا پیغام اپنی فطری سادگی اصلیت اور راست نفسیاتی اثر سے دور ہو کر بحث کرنے والوں کی ذاتی علمیت اور دلائل میں گم ہو جاتا ہے۔"

پچھلے پچاس سالوں میں اقبال پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اگر اس کی جانچ ان اصولوں پر کی جائے تو بڑے دل چسپ نتائج کی توقع ہے۔ ہماری جدید تنقید کے بہت سارے دل چسپ معرکے دراصل ان ہی باتوں سے اجتناب یا تجاوز کی دین ہیں۔

باقی کے تجزیئے کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔

"بانگ درا میں اقبال ایک نوخیز شاعر ہے جو ذوق جستجو کا شکار ہے۔ لیکن اس کے سوالات کا جواب نہیں ملتا۔ پیام مشرق میں اس کے سوالات حل ہونے شروع ہوتے ہیں اور وہ اپنے جوابات کو مشرق کی زبان سے مغرب والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جاوید نامہ میں مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ فکر اقبال کے مکمل شباب اور پختگی کا زمانہ ہے۔ اس میں وہ اپنے خیالات اور نظر کے جملہ مقامات کو ان کی معنویت کے ساتھ دکھا دیتا ہے۔ یہ سہ منزلہ عمارت اقبال کی شعری تعمیر کا ایک مکمل نمونہ بن سکتی ہے جس میں دیگر تصانیف کی کھڑکیاں برآمدے اور دروازے لگے ہوئے ہیں۔"

ان چند جملوں سے باقی کے اس کوشش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ شاعر کی پوری شخصیت کو عہد بہ عہد تقسیم کر کے اس کی فکر پر رائے دینا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محنت طلب کام ہے اور اس انداز کا مطالعہ پورے انہماک اور شفقت کے بغیر ممکن نہیں۔

باقی کا "غنائیہ اقبال" خود اقبال کی پیروی میں ہے۔ لیکن باقی نے اپنے تخیل کی جولانی بھی دکھائی ہے۔ اس کے ہر منظر میں فکر و فن کی جدت طراز بلندیاں ملتی ہیں۔ موسیقی، مناظر کی عکاسی مظاہر فطرت کی پیکریت۔ کرداروں کا پس منظر روح شاعر اور اقبال کے مکالمے بڑے ہی فکر انگیز

ہیں ۔ باقی نے اس طریقہ سے بھی اقبال تک رسائی کی راہوں کو وا کیا ہے۔

"اقبالیات باقی" ایک اقبال شناس کے لکھے ہوئے مختلف مضامین پر مشتمل ایک گلدستہ ہے جس میں ہو سکتا ہے کہ بعض امور اختلافی بھی ہوں لیکن ان سے ان مضامین کی افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ ان مسائل پر اس دور میں لکھا جائے تو اقبالیات کی خدمت ہوگی۔

مصلح الدّین سعدی

اقبال کا خیال اور اس کا حسن و جمال

اقبال نے شعر کیوں کہا؟

"اقبال ایک ہمہ گیر اور ہندوستان کے لیے تو ایک اچھوتی فکر کی شخصیت رکھتے تھے۔ وہ ایک طرف مغربی فلسفہ اور طرز تحقیق سے واقف تھے اور دوسری طرف مشرق کی روح بیدار کے معترف تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ایک ایسا پیام دینا چاہا اور ایک ایسا نسخہ کیمیا تیار کرنا چاہا جو مشرق و مغرب کے اعلیٰ تصورات اور جذبات کا لطیف مرکب ہو۔ بہ حیثیت آرٹسٹ تضاد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا مادہ جو ایک نعمت دروںا جوہر کی صورت میں ان کے پاس تھا رکھتے تھے۔ وہ ان کے اس مشرب شعری کے بہت کام آیا۔ انسان ابھی زندگی اور کائنات کو دو حصوں کے درمیان سوچنے کا عادی ہے۔ مثلاً ازل اور ابد، موت و حیات، آسمان و زمین، خیر و شر، کفر و ایمان وغیرہ۔ لیکن جب وہ غور کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ان دو حدوں کے درمیان ایک عجیب جنگل سر خوش کشمکش ہے اور اسی طوفان میں ساری خدائی پلتی ہے۔ شاعر کا منصب یہ ہے کہ وہ اختلاف کی شورش کم کرے اور طوفان میں امن و سکون کے ساحل مراد کی امید دلائے۔ اقبال کی تحریک شعری اسی نوعیت کی معلوم ہوتی ہے۔ وہ تخیل اور وجدان کے ذریعہ کائنات اور زندگی کی سرحدوں کو چھوتے اور سرحد کے درمیان جو تعمیر نو کا فردوس نظر آتا ہے۔ اسے نظروں کے سامنے لاتے ہوئے فردا کا عالم دکھاتے ہیں۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کے شاعرانہ پیام اور اس کے حسن کے متعلق جب ہم کوئی تحقیقی نقطۂ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو ابتداءً تین سیدھے سادھے سوالات کرنے پڑیں گے جو یہ ہیں۔

(۱) اقبال نے شعر کیوں کہا؟

(۲) اقبال نے شعر میں کیا کہا؟

(۳) اقبالؔ نے شعر کس طرح کہا؟

ان تینوں سوالات کا منشا علی الترتیب یہ معلوم کرنا ہے کہ اقبالؔ کے شعر کی تحریک اور سبب کیا ہے، اس کا عمل کیا ہے؟

اس کا اثر کیا ہے موجودہ قسط میں ہم پہلے سوال کا جواب دیں گے۔ اقبالؔ نے شعر کیوں کہا؟ یہ سوال تو بظاہر سیدھا سادا ہے لیکن اس کا جواب اتنا آسان نہیں ہے۔ اس لیے کہ اول تو کسی شاعر کے جذبۂ شعر گوئی کی تہ تک پہنچنا اور اس کی بنیاد معلوم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ شاعر کا مزاج اور اس کی افتادِ طبیعت بہت پیچیدہ ہوتی ہے۔ پھر اقبالؔ کی طرح جتنے بڑے شاعر ہوتے ہیں اور جن کے کلام میں معانی و مطالب کی گہرائی ہوتی ہے وہ اس امر کی اجازت ہی نہیں دیتا کہ ہم ناقص عقل سے تحریکِ شعر کے عقدہ کو کھول سکیں اور شاعر کے دل کی گہرائی معلوم کر سکیں۔

مختلف محققین نے مختلف طریقوں سے یہ سمجھایا ہے کہ شعر کیوں کہا جاتا ہے، نہ صرف شعر بلکہ جملہ فنون لطیفہ کی محرکات پر تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ ان میں سے چار نظریہ ایسے پیش کرتے ہیں جنہیں اقبالؔ کے جذبہ شعر گوئی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔

جذبہ خود نمائی و خود فروغی

ان میں سے پہلا نظریہ وہ ہے جو علم حیوانات اور فطرت انسانی کی ملی جلی تحقیق سے حاصل ہوا ہے اور جس کا علمبردار ڈارون اور اسپنسر ہے بعد میں مشہور محقق گرانٹ الن (GRANT ALLEN) اور یوروہاروِن نے بھی اس کی تحقیق کی ہے (دیکھو پہلے مصنف کی کتاب تشریحی جمالیات physiological aesthetics) اور دوسرے مصنف کی کتاب "آرٹ کا آغاز"

ان حکیموں کا خیال یہ ہے کہ جملہ حیوانوں میں جس کی بالاتر جنس انسان ہے فطری طور پر ایک قسم کا جذبۂ خود نمائی (self manifestation) اور جذبۂ خود فروغی (self - exaltation) ہوتا ہے جس کی وجہ سے حیوانوں کی حد تک ان کی ضرورت زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور انسانوں کی حد تک ان کا ذوق تکمیل پاتا ہے اس قسم کی تربیت سے انسان فوری ضرور مادی ضروریات زندگی کی تکمیل سے بالاتر ہو کر ایک قسم کی زائد توانائی چند معصوم اور بے غرض لیکن لطیف ترین اور اعلیٰ ترین مسرتوں کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جانوروں میں قدرتاً اور فطرتاً نر مادہ سے زیادہ خوب صورت رنگین اور بانکے ہوتے ہیں اس کی وجہ سے مادہ نر کی طرف رجوع ہوتی ہے اور جذبہ رجولیت پیدا ہوتا ہے جس سے نسلی تخلیق کا سلسلہ پیدا ہوتا ہے بعض جانور خصوصاً بندروں میں تالیاں بجا کر یا ناچ کر اپنے ہم جنسوں کو اپنی طرف رجوع کرنے کا ایک جذبہ ہوتا ہے۔ بعض جانور خوبصورت بولیوں سے توجہ منعطف کرواتے ہیں۔ یہی ایک کیفیت دوسرے انداز سے انسان میں پائی جاتی ہے۔ فنون لطیفہ کی طرف رجوع ہونے کا ابتدائی جذبہ تو اسی قسم کی خود نمائی

اور خود فروشی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ قدیم زمانہ کے جاہل انسان جسم کو مختلف رنگ لگاتے اور قسم قسم کے رنگین عجیب منقش لباس پہنتے تھے۔ ان کے رقص میں بھی ایک قسم کی وحشیانہ اور حیوانی خودنمائی نظر آتی تھی یہ رفتہ رفتہ یہ صفت شائستہ ہو کر ایک قسم کے لطیف حسن آفریں ذوق میں مبدل ہو گئی اور فنونِ لطیفہ کا آغاز ہوا۔ نفسیاتی نقطہ نظر سے اگر جملہ صناع، فن کار اور شاعر اپنے ضمیر اور جذبہ حسن آفریں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر ایک ہستی چھپی بیٹھی ہے جو اپنی نمود چاہتی ہے اور اس کی خواہش یہ ہے کہ اس کے پیام، اس کی آواز اور اس کے کمال پہ دنیا کان لگائے اس سے مسحور اور مرعوب ہو اور اس کی طرف رجوع ہو۔

اقبال کی شاعرانہ زندگی میں یہ جذبہ بلند شخصیت میں مبدل ہو کر اعلیٰ حوصلگی، بلند خیالی اور خدمتِ خلق کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اقبال میں ایک جذبہ خودنمائی ہے لیکن وہ علم و دانش کی فراوانی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اپنے ضمیر کی آواز سے دنیا کو بیدار کرنے دنیا کو ممنون کرنے اور اپنے آپ کو مسرور و مطمئن کرنے کی صفت رکھتا ہے۔ اقبال نے شعر اس لیے کہا کہ ان کے پاس کچھ "سخنہائے گفتنی" تھے جو ان کی خدا عنایات کے ساتھ مل کر شعری پیام بن جاتے تھے بلند شخصیت میں چند نفسیاتی صفات ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ اس میں ایک حکیمانہ اور فاتحانہ انداز ہوتے ہیں جو نتیجہ ہوتے ہیں اس کی اندرونی قوت کا، دوسرے وہ شخصیت دھن کی اس قدر پکی ہوتی ہے کہ اس میں ایک خاص قسم کے ضبط اور جنون کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال میں یہ دونوں صفتیں موجود ہیں جو جذبہ خودنمائی کی غمازی کرتی ہیں اور جذبہ خود فروشی کی بھی۔

نفسی حرکت اور عمل

دوسرا نظریہ ہے کہ ہر انسان کے نفس یعنی دل میں ایک قسم کی خود حرکتی اور عمل کی قوت فطرتاً موجود رہتی ہے۔ اس کا ذہن اور اس کے قویٰ کبھی نچلا بیٹھنا نہیں چاہتے۔ ان کے اندر کچھ کر گذرنے کچھ کرتے رہنے اور کچھ کر دکھانے کی ایک بے چینی سی ہوتی ہے جو عام زبان میں کہا جاتا ہے۔ بیکار مباش کچھ کیا کر۔ لیکن۔ جو لوگ اعلیٰ دل و دماغ رکھتے ہیں اور صناع اور فن کار کی روح بے تاب اپنے سینے میں پوشیدہ رکھتے ہیں وہ بہت زیادہ شدت کے ساتھ خود حرکتی اور خود عملی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان میں بطور خاص دو صفات پوری طرح اپنا عمل کرتی ہیں ایک جذبہ تجسس (   ) اور دوسرے جذبہ حیرت۔ جذبہ تجسس کا ہر شخص تجربہ رکھتا ہے ہر بچہ معصوم سوالات کرتا ہے اور معصوم تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ آرٹسٹ میں بھی بچے کی طرح یہ صفت موجود رہتی ہے وہ کائنات کے ذرے ذرے میں حسن و حقیقت کی تلاش کرتا ہے اور وہ چیز معلوم کرنے کی سعی کرتا ہے جو اس کے اندر بطور جوہر کے پوشیدہ ہیں۔ وہ یہ چیز کی ماہیت ایک خاص والہانہ انداز سے معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اور جب اس کی ماہیت اور جوہر کا انکشاف ہوتا ہے تو وہ اچھل پڑتا ہے اور پھر اس پر اس کے حسن اور اثر کی ایک حیرانی سی طاری ہو جاتی ہے۔ آرٹ تو سراپا حیرت کا آئینہ ہے۔ عقل بھی اس کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ اقبال فرماتے ہیں۔

اک دانش برہانی - اک دانش نورانی
ہے دانش نورانی حیرت کی فراوانی

آرٹسٹ کسی صوفی کسی پیغمبر، کسی روشن ضمیر کی طرح اپنے مشرب اور مسلک کے مطابق ایک دانش نورانی رکھتا ہے اور جس قدر اس کی دانش نورانی فروغ پاتی ہے اس قدر وہ حیرت و استعجاب کے دریا میں ڈوبتا ہے۔

اقبال کے اندر خود حرکتی اور خود عملی کی قوت بڑی شدت کے ساتھ موجود تھی جو آگے چل کر بیش بہا افکار و خیالات کی تخلیق کا سرچشمہ بن گئی وہ سراپا آرزو، سراپا تجسس اور سراپا تحقیق تھے بہ اسرار و رموز حیات معلوم کرنے کا ان میں بے پناہ جذبہ تھا۔ انہوں نے بہت جلد وہ دانش برہانی کی منزلوں سے گذر کر دانش نورانی کی سرحدات میں داخل ہو گئے ان کا آخری کلام بتاتا ہے کہ وہ دانش نورانی کی بدولت ایک قسم کے حیرت استعجاب، استغراق اور محویت کے عالم میں پہونچ گئے جہاں وہ کسی مجذوب کی طرح عالم جذب و مستی میں اسرار حیات کھل کھل کر بیان کرتے ہیں۔ ان میں بے پناہ قوت تحقیق واجتہاد تھی وہ فنی حرکت و عمل کی ایک بڑی ترقی یافتہ اور قابل رشک صورت تھی چنانچہ انھوں نے اعلان کر دیا۔

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

فطرت اور دوگنی مسرت

تیسرا نظریہ یہ ہے کہ جس کی بڑی خوش اسلوبی سے پروفیسر برمیسن (BERMFSON) نے حمایت کی ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر حسن کار اپنے عمل تخلیق میں خواہ وہ معمولی درجے کا ہی کیوں نہ ہو فطرت اور اس کے حسن کی بہ نسبت دوگنی مسرت محسوس کرتا ہے اس لیے وہ اپنے عمل کا آغاز فطرت کی تقلید سے تو کرتا ہے لیکن اس پر اپنی شخصیت اور قوت تخلیق کا اثر ڈالتا ہے اس کے حسن و تاثیر میں انسانی احساس داخل کرتا ہے جس کی وجہ سے آرٹسٹ کے اعمال حسن کار کی نظر میں اصل سے دوگنی مسرت بخشنے والے اور کشش رکھنے والے معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک حیثیت سے حسن کار فطرت سے بلند بالا ہو کر اس پر حکمرانی کا دعا کرتا ہے۔ خوش قسمتی سے اقبال میں فطرت کو مسخر کرنے اور زمین و آسمان کی قوتوں کو علم و عشق کے زور سے اپنا محکوم بنانے کی ایک بڑی مجاہدانہ اور روحانی خواہش تھی اس لیے انھوں نے کوشش کی کہ جس طرح مقام آدم بلند ہوا اسی طرح فطرت کو تسخیر کرنے اور اس پر حکومت کرنے کا پیام بھی جو لفظ و معنی کے قالب میں نمود حاصل کرے نہایت ٹھوس، حقیقی اور شاندار ہو اور اس میں ہر طرف اسرار و رموز کے انکشافات کی بجلیاں سی کوندتی ہوئی نظر آئیں۔ انھوں نے ایک طرف الفاظ کو قالب بنایا تو اپنے پیام کی روح کا بلند مقام دے کر اسے الفاظ کے قالب میں داخل کیا شعر کا یہ عمل

تخلیق اپنے انداز میں فطرت کی اعلیٰ ترین حسن کاری کا اثر رکھتا ہے۔ کیونکہ یہ حسن کار کا خود اپنا پیش کردہ عمل ہے شعر و نغمہ کی یہی وہ تاثیر ہے اور شاعری کے سانچے کی بھی یہی وہ عظمت ہے جس نے اقبال کو نثر سے زیادہ نظم کے پیرائے میں اپنا خیال پیش کرنے پر مجبور کیا اس میں اور کیا کیا قوت رنگ آمیزی اور عظمت پیدا کی گئی اس کا ذکر آگے آئے گا۔

خواب بیداری اور تضاد کی ہم آہنگی

یہ ایک بڑا دلچسپ نظریہ ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر آرٹسٹ کا تخیل فطرتاً تحقیقی یا نقش آفریں ہوتا ہے اس کی ہر نگاہ اپنے اندر ایک اقلیدسی نظام رکھتی ہے جو اشیاء، تو کیا خیالات اور جذبات کے مقام، فاصلے، نزدیکی، دوری، اس کے پیرایہ نمود کو اچھی طرح پہچانتی ہے۔ وہ اپنے تصورات کی دنیا میں حسین اشکال و اعمال کے خواب دیکھتا اور ان کی روشنی میں بھی اپنی کائنات کی تعبیر و تشکیل کی نیند میں گم رہتا ہے جب اس کی نظر کائنات پر پڑتی ہے تو وہ اس کی شکل و صورت ہیئت ترکیبی سے بہ حیثیت مجموعی متاثر ہوتا ہے۔ وہ سوچتا رہتا ہے کہ آفتاب کس طرح بنا، چاند کی روشنی میں اتنی کشش کیوں ہے شفق کے رنگین جلووں میں کون نظر آتا ہے۔ پھولوں کی ہنسی اور شبنم کے گریے کے پیچھے کون کھڑا خیالات کی دنیا پیدا کر رہا ہے۔ اسی الجھن میں اس کی ساری زندگی گذرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب وہ اپنے اندر ایک ایسی قوت تخلیق محسوس کرتا ہے جو خطوط آواز، رنگ سے کام لے کر فطرت کی طرح اپنی بھی چند چیزیں پیدا کر سکے اور اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق اس میں حسن کے جلوے بھر دے تو وہ اچھل پڑتا ہے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گھنٹوں، پہروں اپنے اس کاروبار میں مصروف ہو جاتا ہے اور رات دن یہ سوچتا رہتا ہے کہ میں فطرت سے بھی شاندار اپنی دنیا پیش کر سکتا ہوں یا نہیں؟

اقبال کے فکر و نظر تصور اور مشاہدے میں عظیم الشان خواب کی دنیا نظر آتی ہے۔ وہ نہ صرف تمام قوائے فطری کو اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں بلکہ فطرت اور اس کے حاکم یعنی آدم کی ایک نئی تخلیق و تعمیر بھی چاہتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں اپنے خالق سے بڑی شوخی اور سوز کے ساتھ۔

نقشِ دگر طراز دہ، آدم پختہ تر بیار
لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

اس کی تفصیل ہمارے مضمون کی تیسری قسط میں آئے گی۔ فی الحال یہ سمجھنے کے لیے کہ اقبال نے شعر کیوں کہا، یہ جاننا چاہیے کہ وہ ایک عظیم الشان خواب بیداری دیکھتے تھے اور اس کی تشکیل اور تعمیر کے خاکے منصوبے اور جلوے انھوں نے اپنی شاعری کی دنیا میں شاندار پیمانے پر دکھائے ہیں۔ یہی ان کے جذبہ گوئی کی تیسری صفت ہے۔

اسی سلسلے میں ایک بات اور یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ آرٹسٹ جب ایک خواب بیداری کے عالم میں رہتا ہے تو اس کی نظر میں وہ کشمکش کم ہوتی جاتی ہے جو کائنات کی ہر دو مخالف قوتوں کے درمیان جاری و ساری ہے۔ وہ کیوں جائیں خیر و شر کی آویزش ہی کو لیجیے۔ ہر زندہ شے یہ چاہتی ہے وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ بخش

کے حاصل کرے جو زیادہ سے زیادہ فائدہ بخش ہے وہ خیمے اور ہوا کے خلاف جنگ ہے اسلئے زندگی میں ہر زندہ چیز کو اپنے ماحول میں فطری طور پر اس شے کو حاصل کرنے کا حق انتخاب حاصل ہے جو اس کے لیے مفید اور زیادہ نفع بخش ہے۔ آرٹسٹ کی نظر میں خیر و شر کی بجائے آویزش تنازع البقا کے اسٹیج سے ہٹ کر ایک دلچسپ وقفہ، ایک درمیانی فردوس انتظار بن جاتی ہے جسے شوپنہار آرٹ کہتا ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

ارسطو کا قول ہے حسن دو انتہائی حدوں کے درمیان ایک اوسط ہے۔ آرٹسٹ اسی اوسط کی تلاش میں رہتا ہے اور اس لئے دو انتہائی حدوں یا دو مخالف قوتوں کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی فکر میں رہتا ہے۔ اقبال ابتدا" ان مخالف اور متضاد مقامات کا پورا پورا احساس رکھتے تھے جو فطرت میں کارفرما ہیں انھوں نے اپنی ذات سے منسوب کر کے ایک واضح نظم اس انداز کی لکھ ڈالی تھی جس کا عنوان ہے "عاشق ہرجائی" اور جس کا پہلا شعر ہے

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو
رونق ہنگامۂ محفل بھی ہے تنہا بھی ہے

آگے چل کر انھوں نے ایک ایسا نظام العمل پیش کیا جس میں انسان کی نظر تنازع البقا کی دنیا سے ہٹ کر ایک ایسے نخلستان اور ارتقا [illegible] عالم میں پہنچ جائے جہاں ایک حد ایک مخالف قوت ترقی پا کر دوسری حد یا دوسری مخالف قوت میں ضم ہو جاتی ہے۔ مثلاً ان کے نظریہ علم و عشق کو لیجیے علم کی ابتدا عقل سے ہوتی ہے جو بظاہر مخالف معلوم ہوتی ہے لیکن یہ علم ترقی پا کر عشق بن سکتا ہے جس کا تعلق عالم وجدان اور دل سے ہے۔ علم سے عشق تک کے سارے ارتقائی زینے آرٹ کی دنیا [illegible] اقبال نے دکھانے کی کوشش کی ہے۔ [illegible] یہ مقام دیکھتا ہے چنانچہ علی اختر کہتے ہیں

بساط ہوش سے تا جلوہ گاہ مستی کیف
تجھے تو ڈھونڈ لیا ہے کہاں کہاں میں نے

اصغر اس درمیانی حالت میں ڈوب کر کہتے ہیں

عجیب لطف کا عالم تھا چشم ساقی کا
نہ میں ہوا مجھے بے خود نہ ہوشیار ہوا

نتیجتاً اقبال کے جذبۂ شعرگوئی کی ایک نفسیاتی توجیہہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی نظر میں زندگی ایک ایسی حرکت اور ایسا عمل ہے جو ایک مقام سے دوسرے مقام کو ملاتی اور اس طرح عالم در عالم کرتی جاتی ہے۔ زندگی کی اس طرح تشکیل کے لیے انھوں نے شاعری میں ایسا نظام تو پیش کیا۔ یہ تو وہ عالمی نظریے تھے جن کے تحت ہر شاعر، حسن کار، اور صناع کو جانچا جا سکتا ہے۔ خوش قسمتی سے اقبال نہ صرف بڑے شاعر تھے۔ انھوں نے اسی قوت تنقید کے ساتھ ادب شعر اور فنون لطیفہ کے متعلق کچھ اپنے نظریے بھی پیش کیے ہیں اور جگہ جگہ اپنے کلام اور شخصیت کے متعلق

کلیدی اشارے بھی دیئے ہیں یہ دونوں باتیں اقبال کے محقق کے لیے بڑی کام کی ہیں۔ ہم ان دونوں مسائل کو سمجھنے کے لیے عام نظریوں سے انھیں ملائیں گے اور پھر کلام اقبال کا مطالعہ کریں گے تاکہ نتائج اخذ کئے جا سکیں۔

فنون لطیفہ اور ادب و شعر کے متعلق اقبال کے نظریئے۔

(۱) اقبال کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ادب اور فن کا حقیقی سرچشمہ اگر ہے تو وہ انسان کی خودی اور اس کا ضمیر ہے (خودی اور ضمیر کی تعریف اور اس کی صفات کی تشریح خارج از بحث ہے ضروری مطالب کا ذکر آگے آئے گا۔

(۲) پھر فرماتے ہیں کہ جس طرح ادب خودی سے پیدا ہوتا ہے اسی طرح وہ خودی کی ترویج و حفاظت بھی کر سکتا ہے۔

(۳) ادب کی بنیاد" افکار تازہ" اور زندہ تخیل پر رکھی جانی چاہیے تاکہ انسان کامل کی تعمیر میں یہ حصہ لے سکے

(۴) جملہ فنون لطیفہ اور ادب کا مقصد اولین تخلیق ہے جو مقصد زندگی بھی ہے جو ادیب تخلیق کو اپنا شعار بناتا ہے وہ ایک حیثیت سے مقصد حیات کی تکمیل کرتا ہے۔

(۵) ادیب اور حسن کار جو تخلیق کرتا ہے فطری طور پر کسی خلوت کی تلاش کرتا ہے اور تقلید سے آزاد ہوتا ہے۔ یہ خلوت دل جگر اور سینہ ہے یہاں ہمیشہ آگ سی جلتی رہتی ہے لیکن وہ آگ ہے جو صرف شعلے نہیں اچھالتی بلکہ ہر چیز کو تپا کر سونا اور کندن بنا دیتی ہے دل وہ رمز ہے کہ اگر سمجھ میں آ گیا تو آرٹ کی جملہ منزلیں طے ہو جائیں جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا۔ سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے۔

(۶) اقبال کے نزدیک ادب اور آرٹ ایک فن لطیف کہلانے کے اسی وقت مستحق ہو سکتے ہیں جبکہ ان میں قوت تسخیر ہو یہ قوت بھی ارتقائے آدمیت کا ایک ذریعہ ہے اور ادب کا فرض ہے کہ وہ اس کی مدد کرے اس مقام پر اقبال حکیم نطشے کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں لیکن بنیادی فرق یہ ہے کہ حکیم نطشے جس کو سرچشمہ قوت سمجھتا ہے (دیکھو عزم اقتدار جلد دوم [illegible]) اور اقبال قلب انسانی کو قوت کا خالق قرار دیتے ہیں حسن ہو یا عشق دونوں دل کے تابع ہیں۔

(۷) حسن اور حق کو دیکھنے کے لیے ادیب اور شاعر میں نگاہ ہونی چاہیے[1]۔ یہ نگاہ وہ تجلی ہوتی ہے جو علم سے ترقی کر کے عرفان اور پھر عشق بن جاتی ہے۔ علم و عشق کی ابتدائی اور آخری منزلوں کے درمیان نگاہ کے مختلف مقامات ہیں اور ان کی مختلف تاثیریں ہیں لیکن سب میں بڑی تاثیر وہ ہے جو خودی پیدا کرتی ہے اور حسن و حق کو اپنے اندر جذب

---

[1] بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی
شباب و مستی و ذوق و سرود و رعنائی
اندھیری راتوں میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر، یہ فلک نیلگوں کی پہنائی
سفر عروس قمر کا عماری شب میں
طلوع مہر و سکوت سپہر مینائی
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

اسی طرح دیکھو نگاہ شوق ص ۱۰۹ جس کا آخری شعر ہے۔

نگاہ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو ؛ ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

کرلیتی ہے۔

فطرت کی غلامی سے کر آزاد ہنر کو　　صیاد ہیں مردانِ ہنر مند کہ نخچیر؟

(۸) فطرت کے حسن سے وابستہ ہونے اور متاثر ہونے کے کئی طریقے ہیں۔ مشہور نقاد میا تھو آرنلڈ نے کوئی بائیس طریقے بتائے ہیں۔ اقبال فطرت کے جلال و جمال دونوں کے قائل ہیں اور شرط اولیں یہ ہے کہ حسن کا دونوں سے کام لینا سیکھے اور اس وقت ممکن ہے کہ اس کی خودی ترقی یافتہ ہو صاف فرماتے ہیں۔

معلوم ہیں اے مردِ ہنر تیرے کمالات
صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تُو نے
آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

(۹) شعر و ادب میں سوزِ حیات ابدی ہوتا ہے جو اسے زندگی کی طرح ایک روح بے قرار عطا کرتا ہے یہ روح ہمیشہ یہ نعرہ لگاتی ہے:

ہر آن نیا طور نئی برقِ تجلی اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

شعر اور سوزِ حیات کے متعلق اشارہ ہے ہم شعر کے اسرار سے واقف نہیں لیکن

یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

(۱۰) آخر میں ان کا نظریہ یہ ہے اور بالکل صحیح بھی ہے کہ ہر ترقی جدوجہد اور سخت کوشش کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا ادب کا جوہر اور معجزہ یہ ہے کہ وہ انسان کامل کی تعمیر میں حصہ لے۔

اس پس منظر میں کلام اقبال کا مطالعہ اور محرکات شاعری کی تلاش؛

ہر آرٹ میں ایک خاص صنعت یہ ہوتی ہے کہ وہ غیر اختیاری ہوتا ہے۔ آرٹسٹ یہ جانتا ہے کہ مجھے اس انداز سے کام کرنا چاہیے ان امور کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اپنی فلاں خامیوں کو دور کرنا اور فلاں خوبیوں کو بڑھانا چاہیے۔ یہ اس کے بس کی بات نہیں ہوتی وہ سب کچھ جانتا ہے کرنا چاہتا ہے مگر کر نہیں سکتا۔ ایک بڑا آرٹسٹ وہ ہوتا ہے جس کے اندر فطرتاً آرٹ کی اعلیٰ خوبیاں موجود رہتی ہیں۔ وہ جب ان خوبیوں کا ذکر کرتا یا انہیں پیش کرتا ہے تو گو اس کی نظر عالمگیر محاسن اور صفات پر پڑتی ہے۔ لیکن غیر شعوری طور پر وہ اپنی ہی خصوصیات کے تجربوں کو ہمہ گیر بنا کر پیش کرتا ہے تو بغیر کسی خاص جدوجہد کے اس کے عمل سے خود بخود لطافتیں تراوش کرنے لگتی ہیں یہی کیفیت اقبال کی ہے۔

تحریک اوّل

آرٹ کی معرکہ انگیز قوت پر یقین اس کی لامحدود وسعت پر نظر اور اقتضائے حسن

اقبال آرٹ کو ایک ایسا معجزہ ایک جذب اندروں اور خودی کا ایک ایسا حیات آفریں پیغام سمجھتے تھے

جس سے مردہ دل قوموں کے ضمیر جاگ جائیں ۔ انھوں نے شاعروں کے لیے وہ مقام تسلیم و تجویز کیا جس کی ابتدائی جھلک افلاطون نے دکھائی تھی ۔ افلاطون کی نظر میں حقیقی شاعر اور حقیقی فلسفی وہ لوگ تھے جن کے دلوں پر اس حقیقت اولیٰ کی تمثیل کا انعکاس ہوتا تھا جو ماورائے احساس ہے ۔ انھوں نے افلاطون کی طرح بعض مقامات پر فنون لطیفہ کی تخصیص بھی کی ہے (دیکھو نظم فنون لطیفہ و موسیقی ضرب کلیم) لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ انھیں حسن کاری کے منصب جلیلہ اور اعلیٰ تصور حسن سے انکار تھا وہ آرٹ کا ماتم نہیں کرتے بلکہ آرٹسٹوں کا ماتم کرتے تھے ۔ مختلف طریقوں سے انھوں نے یہ بتایا ہے کہ آرٹسٹ کا ضمیر پاک ہونا چاہیے ۔ اس کے دل میں سوز نمو چاہیے ۔ اس کی نظر حقائق پر رہنی چاہیے ۔ اس کی نگاہ شوق اتنی شوخ رہے کہ پردہ اسرار کو چاک کر سکے حکیم افلاطون کی طرح وہ آخر وقت تک اس عفت قلب و نگاہ کے پیغامبر رہے جو دل وجود کو چیر سکے وہ ہند کے حسن کاروں پر تلخ تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشہ تاریک میں قوموں کے مزار

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

حقیقت یہ ہے کہ اقبال اپنے آرٹ کے ذریعہ عام تصور حسن پر ایک قسم کا اضافہ اور اس میں ایک ترمیم کرتے ہیں ۔ ان کا تصور حسن ایک حیات آفریں ۔ لازوال ، غیر محدود ذی شعور جوہر حیات ہے جس کا مرکز خودی ہے اور جو حق اور خیر کے ساتھ مل کر پیام حیات ابدی پیش کرتا ہے انھوں نے عامیانہ ذکی نسوانی حسن پرستی نہیں کی جو سفلی معاملات حسن و عشق کے سامنے اپنا سر نیاز نہیں جھکایا اپنی شاعری کے مواد کو "آہ و فغان نیم شبی" "سوز و ساز" اور تلاش حقیقت کے مجتہدانہ عمل سے حاصل کیا تاکہ اس میں قلوب اور روح انسانی کو مسخر کرنے کی تاثیر ہو اور وہ شعور خودی میں انقلاب پیدا کرنے کا معجزہ دکھا سکے اپنا مقام و فکر و نظر متعین کیا جو پیغمبرانہ انکشاف و عرفان کا مقام ہے وہ کہتے ہیں :

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

یہاں شاعری سے مراد عام قافیہ پیمائی یا منظوم جذبات انگیزی ہے ۔

آرٹ کی قوت پر یقین اور تصور حسن و حیات کی یہی وہ وسعت تھی جو اقبال کے جذبہ شعر گوئی کی صفت اولین قرار دی جا سکتی ہے جو ان کو شاعری کا دامن تھامنے پر مجبور کرتی تھی ۔

تحریکِ دوم

خودی اور اس کا شاعرانہ عمل

اقبال کے پیام کا سنگ بنیاد فلسفۂ خودی ہے اور اس کے بہت وسیع مفہوم ہیں۔ یہاں ہم اس کی تفصیل اور تشریح کرنا نہیں چاہتے بلکہ اپنے آپ کو خودی کی اس قوت تک محدود رکھنا چاہتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو خودی کی اس قوت تک محدود رکھنا چاہتے ہیں جو اقبال کے نزدیک آرٹسٹ کے اندر پرورش پانی چاہیے۔

اقبال کی شاعری میں ایک کیفیت یہ پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے دل میں چھپے ہوئے تحریک نفسی (AUTO MATISM) قوت و عمل (MOTORIMPULSE) کو آرٹ کے ذریعہ ترقی دیں اور تشفی بخشیں۔ خود فرو خود حرکتی قوت ہے جس پر خودی کا ڈرامہ کھیلا جاتا ہے اور آرٹ کو داخلی نشو و نما اور اندرونی جذبہ نمو کا آئینہ بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ آرٹسٹ کی خودی میں تین صفات کے وجود کے قائل ہیں (۱) ادب کے ذریعہ خودی کی حفاظت کی جائے اور اس سے حیات ابدی پیدا کی جائے فرماتے ہیں :-

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یکدانہ

ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود ان کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و فسانہ

ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

ضرب کلیم ص ۹۵

پھر کہتے ہیں :-

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا

اقبال کی شاعری میں ان کی شخصیت کا یہی رنگ نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ہر شعر کو ایک نقش جاوداں سمجھتے ہیں اور اس کے ذریعہ ایسی سانس پھونکتے ہیں جو مردہ دلوں اور خیالوں کو نئی زندگی بخشتے ہیں۔ ان کی شاعری ایک ایسے روشن ضمیر بازو والے پر سوز درویش کا مجسمہ ہے جو اقبال کی خودی کو اپنی باہوں میں لے کر اسے ان حوادث سے محفوظ رکھنا چاہتی ہے جو عام طور پر شاعر کی زندگی کو آ گھیرتے ہیں

(۲) شاعرانہ خودی کی دوسری صفت یہ ہے کہ اس میں تخلیق کی قوت ہے آزادیٔ افکار سے مالا مال ہو اور

ایک پرسوز مرکز سے وابستہ رہے ہیں جو سانس نکلے آتش ناک بن کر نکلے۔ وہ اپنی شاعری کو ایسا محرم راز بنانا چاہتے ہیں جو ایک طرف خود ان کی ذات وصفات بلند شخصیت کی ترجمانی کرے دوسری طرف وہ اسرار خدائی سمجھائے جو دوسری زندگیوں کو بیدار کر سکے اپنے شعر سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں۔

ہے محرم بہ کو نئی لذت پیدائی کا
تو ہوا فاش تو ہیں اب میرے اسرار بھی فاش

شعلے سے ٹوٹ کے مثل شرر آوارہ نہ رہ
کر کسی سینہ پرسوز میں خلوت کی تلاش

وہ یہ چاہتے ہیں کہ شاعر کو اپنی خودی کا پورا پورا احساس رہے اور اپنے آرٹ میں قوت تسخیر پیدا کرنے کے لیے مجاہدانہ سعی عمل سے کام لے۔ خودی کی تربیت کرے یعنی شاعر کی حیثیت سے وہ کم از کم اپنے جذبات واحساس کو فاقانہ گرم رو اثر انداز حیات آفریں اور ولولہ انگیز بنائے یہ خود فروغی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ اپنی طرف اشارہ کرتے ہیں خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور

مجھے خبر نہیں یہ شاعری ہے یا کچھ اور
عطا ہوا ہے مجھے ذکر و فکر جذب و سرور

تیری خودی کا غیاب معرکۂ ذکر و فکر
تیری خودی کا حضور عالم شعر و سرود

روح اگر ہے تری رنج و غلامی سے نزار
تیرے ہنر کا جہاں دیر و طواف و سجود

(۳) تیسری صفت یہ ہے کہ شاعر اپنی شاعری کو دل اور ضمیر سے وابستہ رکھے۔ اور یہ سمجھ لے کہ دل کیا شے ہے؟ فرماتے ہیں:۔

آیا ہے کہاں سے نالہ نے میں سرور مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوب نے

دل کیا ہے اس کی مستی وقوت کہاں سے ہے
کیوں اس کی اک نگاہ الٹتی ہے تخت کے

کیوں اس کی زندگی سے اقوام میں حیات
کیوں اس کے واردات بدلتے ہیں پے بہ پے

کیا بات ہے کہ صاحب دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنت روم و شام وے

جس روز دل کے رمز مغنی سمجھ گیا
سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے
(ضرب کلیم صفحہ ۱۱۳)

تحریک سوم

تضاد میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور ایک فردوس علم و عمل پیدا کرنا جو زندگی کا حسن رکھے

اقبال کی شاعری کی تیسری تحریک اچھوتی نوعیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے تمہید میں بیان کیا۔ ارسطو کا مزاج ایک قسم کے اجتماع اتحاد و ہم خیالی کا پیغامبر ہوتا ہے۔ وہ دو مخالف قوتوں کے تخریبی اثر کو اس طرح کم کرتا ہے کہ ان کے درمیانی عالم کے جلوے دکھا کر انسان کے لیے ایک فرصت فکر و نظر اور وقفِ امن و نجات پیدا کرتا ہے اقبال کے فکر و نظر کی دو حدیں ازل اور ابد ہیں اور انہیں کے درمیان وہ مشرق و مغرب علم و عمل کا امتزاج چاہتے ہیں اور روح انسانی کو اتنی وسعت دینا چاہتے ہیں کہ وہ کونین کو اپنی آغوش میں سمیٹ لے اپنی فکر و نظر کے "وسط زریں" کے متعلق واضح اعلان کیا ہے۔ کہتے ہیں:

خودی نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیث رندانہ

فارسی زباں میں اس سے بہتر شعر کہا:۔

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنی ناقدری کا اس طرح ماتم کیا:۔

کس نہ دانست کہ من نیز بہائے دارم
آں متاعم کہ شود دستزدِ بے بصراں

اقبال کی ایک ہمہ گیر اور ہندوستان کے لیے تو ایک اچھوتی قسم کی شخصیت تھی وہ ایک طرف مغربی فلسفہ اور طرز تحقیق سے واقف تھے اور دوسری طرف مشرق کی روح بیدار کے معترف تھے انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ایسا پیام دینا چاہا اور ایک ایسا نسخہ کیمیا تیار کرنا چاہا جو مشرق و مغرب کے اعلیٰ ترین تصورات و جذبات کا لطیف مرکب ہو حقیقت آرسٹوٹ تضاد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا وہ ایک زندہ اور توانا جوہر رکھتے تھے وہ ان کے اس مشرب شعری کے بہت کام آیا انسان زندگی اور کائنات کو دو حدوں کے درمیان سوچنے کا عادی ہے مثلاً ازل و ابد موت و حیات خیر و شر کفر و ایمان وغیرہ۔ لیکن جب وہ غور کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ان دو حدوں کے درمیان ایک عجیب ہنگامہ خیز کشمکش اور اس طوفان میں ساری خدائی ملتی ہے۔ شاعری کا منصب یہ ہے کہ وہ اختلاف کی شورش کم کرے اور طوفان میں امن و سکون کے ساحل مراد امید دکھائے اقبال کی تحریک شعری اسی نوعیت کی

معلوم ہوتی ہے وہ تخیل اور وجدان کے ذریعے کائنات اور زندگی کی سرحدوں کو چھوتے اور ان سرحدوں کے درمیان جو تعمیرِ نو کا فردوس نظر آتا ہے اسے نظروں کے سامنے لاتے ہیں۔ خودی کی تعریف میں وہ اپنی وسعتِ نظر کو اس طرح پیش کرتے ہیں اور وسط زرین کا اس طرح عالم دکھاتے ہیں :۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریِ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے!
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے! (بالِ جبریل صفحہ ۱۶۲)

ان اشعار میں دو حدیں یہ ہیں :

(۱) جلوہ بدمست (۲) خلوت پسند (۱) سمندر (۲) بوند اندھیرا (۲) اجالا (۱) من (۲) تو (۱) ازل (۲) ابد۔ ان سب کو خودی میں سمویا ہے۔

معنوی اعتبار سے ان کے پیام کی روح رواں میں بھی یہی جذبہ ہے کہ مادہ اور روح کی درمیانی خلیج پاٹ دی جائے اس کے لیے مقامات ہیں مثلاً عقل و دل ذکر و فکر وغیرہ ان دونوں کا امتزاج اس طرح دکھایا ہے۔

یہ ہیں سب ایک ہی سالک کے جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے عَلّمَ الاسما

مقامِ ذکر کمالاتِ رومی و عطار
مقامِ فکر مقالاتِ بوعلی سینا

مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکاں
مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

علم و عشق کو انسانی فکر و عمل کے آغاز و انجام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اقبال کی نیت یہ تھی کہ روحِ انسانیت کو اس طویل رستے پر لگا دیں اور صراط کا پتہ نشان بھی دے کر منزلِ ماکبریاست کی حدی خوانی بھی کریں۔ چنانچہ علم و عشق کا تقابل کرتے ہوئے دنیا دارِ اہلِ علم کو اس طرح تلقین کرتے ہیں :۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

بندۂ تخمین وظن کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب!

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقام صفات عشق تماشائے ذات

عشق سکون وثبات، عشق حیات ودمات
علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت وفقر ودیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج ونگیں

عشق مکاں ومکیں عشق زماں وزمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح یاب!

شرع محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام

عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب!

اسی طرح اقبال ایک اچھوتا اور بلند مقصد اپنے پیش نظر رکھتے ہیں کہ عقل وعشق کا ہاتھ میں ہاتھ ملایا جائے۔ یہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ آخر میں دیکھنا یہ ہے کہ ان کے پیش کردہ ادبی نظریوں میں سے کون سے نظریئے خود ان کی شاعری کی محرکات میں کارفرما ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی اس کی تین صفتیں بتائی جاسکتی ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ اقبال کی شاعری نہ صرف ان کی خودی سے پیدا ہوی ہے بلکہ ان کی خودی کی تعمیر وتحفظ کی منزلیں بھی دکھاتی ہے۔

(۲) دوسرے وہ تخلیق آزادی فکر بلند تخیل اور سوز دل کے پیغمبر ہیں ان کے کلام میں آہ وفغان نیم شبی کی پوری شان ہویدا ہے

(۳) تیسرے وہ دل اور ضمیر کے مقام سے آگاہ ہوکر حیات ابدی کا ایک امیازندہ پیغام دیتے ہیں جو روح میں بیداری پیدا کرتا ہے۔ اور ایک جہان نو اور آدم پختہ تر کی تخلیق وتعمیر کے مقامات دکھاتا ہے۔ شاعری کے ذریعہ خود اپنی وجدانی قوتوں کو ترقی دینا اور دوسروں میں زندگی پیدا کرنا یقیناً اقبال — یعنی شاعر مشرق کے شایان شان ایک اچھوتا کارنامہ ہے۔

علّامہ اقبالؔ کا فلسفہ

گزشتہ مہینے کے جامعہ میں ایک مختصر مضمون نظر سے گزرا جس کا عنوان ہے۔ "علامہ اقبال کا فلسفہ" مدیر صاحب نے دعوت دی ہے کہ اس پر کچھ اظہار خیال کیا جائے۔ اس لیے میں نے مضمون بغور دیکھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ عنوان تو بہت وسیع ہے۔ مگر بحث اتنی وسیع نہیں۔ اصل بحث کے اعتبار سے صحیح عنوان "اقبال کا فلسفۂ عقل و دل" ہو سکتا تھا۔

مدیر صاحب نے اپنے نوٹ میں فاضل مصنف کے اصل خیال کی وضاحت کر دی ہے۔ مگر مضمون کے پڑھنے سے مجھے علم نہ ہو سکا کہ کن اصولی طریقوں سے عقل و دل کے فلسفہ پر فکر کی گئی اور جو نتائج نکالے گئے ہیں ان کی قدر و قیمت کیا ہے۔

جب کسی شاعر کے فلسفہ یا پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے یا اس سے اختلاف اور اتفاق کیا جائے تو ضروری ہے کہ ہم اس انتشار اور پیچیدگی کو دور کریں جو اس موضوع میں پائی جاتی ہے یا مشکل موضوع پر سوچتے وقت خود فکر کرنے والے کے دماغ میں موجود رہتی ہے۔ واضح فکر اور سکون دماغ ادبِ عالیہ پر تنقید کرنے کے سنگ بنیاد ہیں۔ جو صاف سوچتا نہیں۔ وہ صاف لکھتا نہیں۔

ہم ان تمام الجھنوں سے نکل کر جو مکالمہ میں پیدا کیے گئے ہیں اور ان لفظی گورکھ دھندوں سے دور ہو کر جو اختر اور یوسف کی گفتگو میں پائے جاتے ہیں۔ مصنف کی اس بحث پر کہ اقبال کا فلسفۂ عقل و دل کیا ہے؟ جب غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کی ابتدا ہی ایسے اصول سے کی گئی ہے جو شعری تنقید کے لیے زیادہ موزوں نہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ مصنف، شاعر کے کلام کی جراحی اور نثری تحریر سے کلام کا منتشر تقابل کرنا

چاہتے ہیں۔ تاکہ اس کے پیام کا تعین ہو سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ اُردو شعر و ادب کی تنقید سے یہ خام طریقہ دور نہ ہو سکا۔

اقبال کے مفکرین عام طور پر تین قسم کی پیچیدگیوں کا شکار ہوتے ہیں۔

۱۔ وہ اقبال پر وضاحت نظر اور سکون دماغ کے ساتھ غور نہیں کرتے بلکہ بے دھڑک ایک سمندر میں کود پڑتے ہیں جس میں کودنے کے بعد باہر نکل آنے کا راستہ نہیں ملتا اور انھیں سوائے اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے کے کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

۲۔ اقبال جیسے مفکر اور شاعر پر اس کے علمی معیار اور بلند مقام کا صحیح اندازہ کیے بغیر رائے زنی کی جاتی ہے۔ حالانکہ اس ذی علم اور ذی ہوش انسان کے فکر و نظر پر اسی وقت بحث ہو سکتی ہے جبکہ اس کے متعلقہ علوم پر نقاد کو بھی دستگاہ ہو۔

۳۔ اقبال کے فلسفے یا پیغام کا بہ حیثیت مجموعی کم اندازہ کیا جاتا ہے اور تجزیہ زیادہ نفسیات، ادبی تنقید کے اعلیٰ اصول اور جمالیات جیسے علوم سے ہٹ کر تحقیقات کی بنیاد متفرق تجزیے یا تقابل پر رکھی جاتی ہے۔ حالانکہ تجزیہ سے زیادہ ربط (SYNTHESIS) کی ضرورت ہے۔

اس انداز کی بحثوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک بڑے شاعر کا پیغام اپنی فطری سادگی اصلیت اور راست نفسیاتی اثر سے دور ہو کر بحث کرنے والوں کی ذاتی علمیت اور دلائل میں گم ہو جاتا ہے۔ دوسرے ..... اقبال کی تشریح و توضیح میں اتنی ہی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ جتنی کہ شرح کرنے والے کے دماغ میں رہتی ہے قرآن مجید کی تفسیروں نے جس طرح قرآن کو "آیات بینات" کی حد سے نکال کر فقہ، تصوف اور کلام کی گتھیوں میں الجھا دیا اسی طرح اندیشہ ہے کہ اقبال اور اس کا کلام جو تعلیمات قرآنی سے دور نہیں ہمارے فہم و ادراک، جذبہ اعتراف و قبول اور ہماری شعوری زندگی کے قریب رہنے کی بجائے علمی بحث اور انفرادی منطق میں گم ہو جائے۔

نفس مضمون پر غور کرنے سے قبل حسب ذیل تین امور کو ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

۱۔ شاعر اقبال فلسفی نہیں ہے۔ "فلسفی" کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو اپنے مسائل پر ایک خاص نقطۂ خیال، انہماک اور علمی انفرادیت کے ساتھ غور کرتا اور آخر وقت تک ان کی تحقیقات رد و قبول کر کے ایک نظام فکر متعین کرتا ہے۔ اس نظام فکر معقولیت، مرکزیت ارادہ و

شعور پورے طور پر جاگزیں ہوتا ہے۔ شاعر کے حکیمانہ خیالات کو فلسفہ سے متصادم نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے فلسفی اور شاعر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے کیونکہ فلسفی ایک ذی شعور انسان "پاسبان عقل" کا محکوم، منطق اور معقولیت کا شکار ہوتا ہے اور اسکے برعکس شاعر ایک جذباتی انسان سعور، منطق ادراک اور احتیاط کی حدود توڑ کر دنیائے تخیل میں اپنی وجدانی دنیا آپ بنانے والا۔ ہاں اگر کلام کی نوعیت اس قسم کی ہو تو بعض شاعروں کے عمیق تصورات کو "حکیمانہ شاعری" کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

اس شاعری کا کوئی "مستقل" نظام فکر" یا معقول اور منطقی سحاذ قائم کرنا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی بعض صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کر کے اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے احساسات کو ابھار سکیں۔

۲۔ جس طرح شعر کی دنیا فلسفہ" نہیں ہوتی اسی طرح وہ کوئی منطق یا نظام العمل بھی نہیں ہوتی جسے ہم کانگریس یا مسلم لیگ کے پروگرام کی طرح اپنی زندگی کا ایک راست اور بالارادہ لائحہ عمل بنا سکیں۔ شاعر کسی نصب العین کی جھلک دکھاتا اور اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ جس کا مقصد عقل کے بندوں کو تشفی بخشنا یا قایل کرنا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو دل فریب بنانے کے لیے جذبات اور احساسات سے کھیلتا ہے۔ ممکن ہے اس طریقہ سے عقل بھی بیدار ہو جائے۔

۳۔ اقبال خوش قسمتی سے کہیے یا بدقسمتی سے نثر نویس بھی تھا۔ اس نے چند مقالے لکھے اور تقریریں کیں۔ ہم ان سے اس کی تعلیمات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اور نظریات اور عالمانہ خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ شعری دنیا میں یہ عالمانہ خیالات داخل ہو کر کیا اپنی اصلیت قائم رکھتے ہیں؟ یا کسی دوسرے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں؟ شاعری کس طرح خیالات میں رنگ آمیزی کرتی اور ان میں کیا وسعت و اثر پیدا کرتی ہے۔ وہ خود شاعر نہیں جانتا۔ اس لیے اقبال کے نظریات اور فلسفیانہ عقائد کو معلوم کرنے کے لیے اس کی تقریروں اور مقالوں کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن ان اصولوں کو شعر کے ذریعہ سمجھنے کے لیے دنیائے شعر کی "جادوگری" کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ میں ۲۵ سال سے متواتر اقبال کے کلام سے وابستہ رہا ہوں۔ میں نے اس کی پہلی نظم "کوہ ہمالہ" کے بعد سے برابر ان کے ارتقائے خیال کا مطالعہ کیا ہے اور لفظی بحثوں سے ہٹ کر ہمیشہ "شاعر اقبال" میں "انسان اقبال" کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں جب کبھی اس کے کلام اور فلسفے

پر غور کرتا ہوں تو ان کے الفاظ، تشبیہات اور استعارات کے بہت پیچھے، نفس شعور ادراک اور احساس کی اس دنیا میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں جہاں سے خیال کی آفرینش ہوتی ہے اور وہ خیال اپنی کئی نفسیاتی منزلیں طے کرتا ہوا شعر کے قالب میں اپنی نمود حاصل کرتا ہے۔ غالب نے کہا تھا ؎

بیتم از گداز دل، درد جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

اس کے مطابق شعر کے سمجھنے کا میرا اپنا یہ اصول رہا ہے کہ میں شعر کے الفاظ پر (جو عکس خیال ہوتے ہیں، خیال نہیں ہوتے) غور کرنے کے بجائے "گداز دل" کو محسوس کروں اور "رہ بہ ضمیر" حاصل کروں۔ اس طرح میں شاعر کو بغیر دیکھے ہوئے اس کی شعری تصویر پر ناز کرتا ہوں۔

فاضل مصنف کے مضمون میں جو طریقہ فکر و استدلال ہے اس سے مجھے اصولی اختلاف ہے۔

اقبال کے ذہنی ارتقاء پر مسلسل غور کرنے والے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اقبال میں شروع ہی سے دو متضاد قوتیں موجود تھیں، ایک عقل کے راستے سے غور و فکر، دوسرے دل کے راستے سے مشاہدۂ باطن۔ اقبال کو کچھ دنوں بعد جب ان دونوں قوتوں پر تھوڑا سا اعتماد ہو گیا تو اس نے کہا ؎

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

ان دو قوتوں کو اقبال ہمیشہ اپنے سینے میں دبائے ہوئے رہے۔ وہ ایک طرف "درس حکیمان فرنگ" یعنی فلسفہ دوسری طرف "صحبت صاحب نظراں" یعنی مشرقی تصوف کو اپنی شاعرانہ زندگی کی روح بنائے رہے۔ لیکن یہ دو قوتیں آگ اور پانی کی طرح اس کے دل میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہیں۔ اگر ہم بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک اس کی تصانیف کا مسلسل مطالعہ کریں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعرانہ زندگی اور خیال کی مختلف منزلوں پر یہ دو قوتیں کس طرح متصادم ہوتی رہیں۔ نتیجہ کیا نکلتا رہا اور ان دونوں کے باہمی تصادم کا مآل کیا ہوا؟ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے ہمیں اس کی جملہ تصانیف میں تین کا مطالعہ ضروری ہے۔ ایک "بانگ درا" دوسرے پیام مشرق، تیسرے جاوید نامہ۔ باقی تصانیف ان تین اہم تصانیف کے درمیانی خلا کو پُر کرنے والی ہیں۔ یا وہ کڑیاں ہیں جو خیال کے ان تین ممتاز مقامات کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔

بانگ درا میں اقبال ایک نوخیز شاعر ہے جو ذوق جستجو کا شکار ہے لیکن اس کے سوالات کا جواب

نہیں ملتا۔ پیامِ مشرق میں اس کے سوالات حل ہونے شروع ہوتے ہیں اور وہ اپنے جوابات کو مشرق کی زبان سے مغرب والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جاوید نامہ میں مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ فکر اقبال کے مکمل شباب اور پختگی کا زمانہ ہے۔ اس میں وہ اپنے فلک پرواز خیالات اور نظر کے جملہ مقامات کو ان کی معنویت کے ساتھ دکھا دیتا ہے۔ یہ سہ منزلہ عمارت اقبال کی شعری تعمیر کا ایک مکمل نمونہ بن سکتی ہے۔ جس میں دیگر تصانیف کی کھڑکیاں، برآمدے اور دروازے لگے ہوئے ہیں۔

پیامِ مشرق کی منزل پر اقبال ایک قسم کی کش مکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کے بعض سوالات کا جواب ملتا ہے۔ اور بعض کا نہیں لیکن اس کش مکش میں وہ جن مستقل نتیجوں پر پہنچ جاتا ہے۔ ان میں دو یہ ہیں جو ہمارے موضوع کے لیے مفید ہیں۔

۱۔ یورپ میں عقل کی ترقی ہوئی اور اس نے زندگی کے مادی معیار کو بہت بلند کر دیا۔ حالات زمانہ کے لحاظ سے اقوام کو یہ درجہ بھی حاصل کرنا ضروری ہے۔

۲۔ یورپ عقل کی ترقی میں روح، دل قلب اور باطن کی قوت سے دُور ہو گیا۔ مشرق ہنوز اس روحانیت کا محافظ اور علمبردار ہے۔ لیکن یہ آگ سینۂ مشرق میں چنگاری بن کر راکھ کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ ان چنگاریوں کو بھڑکانا اور نئی آگ سلگانا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔

فلسفۂ عقل و دل کی اصل اور حقیقت سمجھنے کا مقام یہی ہے۔ پیامِ مشرق کے دور میں یہ ہوا کہ اقبال کی توجہ عقل کی طرف سے زیادہ تر دل کی طرف پلٹ گئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مغرب کی مادی ترقی مشرق کی روحانی نجات کا باعث نہیں ہو سکتی۔ "مجلس حکیمان فرنگ" پر "صاحب نظران" کی خاموش تعلیمات ہر طرح حاوی آتی رہی ہیں۔ چنانچہ جاوید نامہ کے بعد سے اقبال عقل کی دنیا سے پورے طور پر دل کی دنیا میں داخل ہو گئے۔ اور ایک مفکر درویش کی نعرۂ اللہ ہو، لگانے لگے۔

کلام اقبال میں "عقل و دل" کی یہ کشمکش بڑی دل چسپ ہے۔ جب "ذوق جستجو" بڑھ گیا اور شاعر دور تشکیک سے گزر کر دور یقین میں آ گیا تو اسے حقیقت کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اس منزل پر اس نے اپنا مستقل نظریہ جو قائم کر لیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

حقیقت ایک کُل ہے جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظری، دوسرا روحانی۔ یورپ کی آنکھ حقیقت کے نظری پہلو کو بخوبی دیکھ سکتی ہے۔ لیکن اس کی روح میں صرف مشرق ہی ڈوب سکتا ہے۔ اس لیے عصر حاضر

کی بیدار مغز قوموں کی زندگی اسی میں ہے کہ وہ حقیقت کو عقل اور دل دونوں کی آنکھوں سے دیکھیں۔ جسم اور ساخت پر غور کرنا عقل کا کام ہے۔ اور جو چیز جو قوت روح کی دنیا کی تلاش کرے وہ دل ہے۔ اس دلچسپ مسئلے پر انشاء اللہ بشرط فرصت میں کچھ اور لکھوں گا۔

ہم نے مختصراً یہ دیکھ لیا کہ اقبال کا ارتقائے ذہنی کس ماحول میں ہوا۔ اب یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اقبال کے پیام کے چار اہم موضوع ہو سکتے ہیں۔

(۱) عشق (۲) عمل (۳) یقین (۴) خودی

میں نے پہلے ہی کہا کہ اقبال کچھ تو اپنے فلسفیانہ مزاج، کچھ محور علم اور کچھ افتاد زمانہ کی وجہ سے مجبور ہوئے کہ عقل و دل کی دو متضاد قوتوں کو اپنے سینے میں پرورش کرتے رہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان دونوں کو ملانے کی کوشش کی۔ چونکہ ان کا خیال تھا۔ جس طرح کہ ابھی واضح کیا گیا کہ موجودہ زمانہ کو عقل و دل دونوں کی بیداری کی ضرورت ہے۔ اس کشمکش میں انھوں نے دو اہم سوالات کیے۔

۱۔ انسان کی آخری نجات اور انتہائی بلندی کس چیز میں ہے؟

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس سوچ میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

۲۔ اس کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؟

ان دو اہم سوالوں کا جواب ان کی فکر و مشاہدہ کی گہرائی نے یہ دیا کہ انسان کی آخری نجات عشق ہے مجھے اس موضوع پر تفصیل سے کچھ لکھنا نہیں ہے۔ اس لیے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اقبال کا "فلسفۂ عشق" یا "من کی دنیا" قدیم صوفیوں سے مختلف نہیں ہے۔ البتہ اس کے حاصل کرنے کے طریقوں میں کچھ اختلاف ہے۔ عشق کی منزل تک پہنچنے کے لیے انھوں نے تین راستے متعین کیے:

(۱) خودی (۲) یقین (۳) عمل

عمل ایک جامع لفظ ہے جو دنیاوی اور روحانی دونوں قسم کے مقاصد پر حاوی ہے۔ عمل کا پیام دینے سے اقبال کی مراد سوئی ہوئی اور کاہل قوم کو جگانا، ترقی پر آمادہ کرنا اور اُسے کام کی قوت دکھانا ہے۔ خواہ وہ سیاست ہو یا ریاضت، اس پیغام کو انھوں نے طرح طرح سے اکسایا۔ دو ایک مثالیں خود جوہر صاحب کے دیئے ہوئے اشعار سے معلوم کیجیے:۔

لاکھ کلیم سر بجیب، ایک کلیم سر بہ کف

(۲) زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے فقط ایک مسئلہ علم کلام

(۳) وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو   ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستی کردار

یقین: شعری دنیا میں اقبال کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم مسلم کچھ تو یورپ کی جدید تہذیب اور علوم کی زد میں آکر ان حقائق حیات پر اپنا یقین کھو بیٹھی ہے جسے تیرہ سو برس پہلے پیدا کیا گیا تھا۔ جتنا جس بات پر یقین ہوگا اتنی ہی قوت عمل اور احساس پیدا ہوگا عمل میں جوش پیدا کرنے کے لیے حقائق پر یقین رکھنے کی تلقین ایک ضروری تلقین تھی جو اس آزاد خیال زمانے میں خاص جرات اور حکمت کے ساتھ کی گئی۔ ایسے دور میں جبکہ انسان ہر حقیقت کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا ہے اور علوم کو نظریات کے باہمی تصادم کی وجہ سے اسے حقیقت ایک بے معنی چیز معلوم ہونے لگی ہے۔ ذوق یقین کو اکسانا کمال تھا۔

خودی: یقین اور عمل کے ساتھ ساتھ احساسات کی بیداری ضروری تھی۔ اس مقام پر انھوں نے اپنا فلسفۂ خودی جس کا تعلق عقل سے ہے خاص انداز سے پیش کیا۔ یہی وہ منزل ہے جہاں اقبال کی تخلیقی قوت اور ایک خاص پیغام کی جھلک نظر آتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح فاضل مصنف نے کہا۔ اقبال اس بے خودی کے مخالف تھے جس کی تعلیم نے مسلمانوں کو سست احساس اور کاہل بنا دیا تھا۔ اس لیے انھوں نے یہ کہا کہ اب انسان کو اپنی بلندی مقام اور اپنی روحانی اور عقلی قوتوں کو منفی طریقے کے ساتھ نہیں بلکہ مثبت طریقے کے ساتھ معلوم کرنا چاہیے خودی کیا بے خودی دونوں کا راستہ ایک ہے۔ دونوں عشق کے ذریعہ خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ لیکن حالات زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ منزل کبریا کا سفر پوری خود شعوری کے ساتھ کیا جائے جس طرح مصنف نے سمجھا۔ اس مقام پر خودی اور عشق، عقل و دل یا تن کی دنیا اور من کی دنیا میں کوئی تضاد واقع نہیں ہوتا۔ وہ خودی کے ذریعے یہ چاہتے ہیں کہ انسان "یزداں بہ کمند آور" کا جذبہ پیدا کرے۔ خدا ایک بلند مقام کا نام ہے اور اس مقام کا حصول اور یہاں تک رسائی کے لیے پہلے حوصلے کی ضرورت ہے۔ حوصلہ خودی کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ خدا کو پانے دیکھنے کے لیے لازمی ہے کہ انسان اپنی ساری قوتوں کو بلند کرے۔ ایک جگہ جمع

کرلے اور بلند مقام پر آکر خدا کو دیکھے۔ یہ عمل اس کی شایان شان ہے۔ اسی طرح خودی نصرف عقل کا راستہ بلکہ روح کا راستہ بھی بن جاتی ہے۔ تزکیۂ نفس، ریاضت، ذکر و شغل، مراقبہ سب جائز، لیکن اقبال کے فلسفہ کے مطابق یہ خود انکاری (Self Denial) کی اسپرٹ میں نہیں بلکہ خود شعوری (Self Consciousness) خود ثباتی (Self Assertion) کی روح اور ارادے کے ساتھ۔ ان کا خیال تھا کہ خودی کے شعور اور اس کی بلندی کا ارادہ عام انسانوں کے فائدے کی چیز بن کر دنیوی اعتبار سے بھی مفید ہوگا۔ اگر یہ آئندہ چل کر بے خودی میں مبدل ہو جائے تو اس کی یہ تبدیلی وقت اور مقام کے شایانِ شان ہوگی۔ اس خودی کے دو روپ ہیں :—

(۱) خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ؛ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ "سخر لکم ما فی السّمٰوٰت و ما فی الارض" کی نہایت ذی شعور، حکیمانہ تفسیر ہے جو اس زمانے میں کی جا سکتی ہے۔

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو طریق خانقاہی میں اسے

جوہر صاحب کے پیش کردہ اس شعر میں خودی کا وہ تصور جو میں نے ابھی بیان کیا عمدگی سے واضح ہوتا ہے طریق خانقاہی گو فرسودہ ہو چکا ہے۔ لیکن عشق کے لیے ضروری ہے البتہ اس میں پختہ تر ہونا چاہیے وہ اس طرح سے کہ ذکر اور فکر دونوں میں انسان محو ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ذکر کا تعلق دل سے ہے اور فکر کا تعلق عقل سے ہے جیسے اقبال کسی اور جگہ کہتے ہیں۔

گفت مرگِ عقل، گفتم ترک فکر ؛ گفت مرگ قلب، گفتم ترک ذکر

ان مختصر توضیحات سے معلوم ہوا کہ اقبال کے نزدیک انسانی ترقی کی آخری منزل عشق ہے۔ جہاں خدا ہاتھ آتا ہے۔ اس تک پہنچنے کے تین راستے، ایک خودی (۲) عمل (۳) یقین۔ انھیں پر زور دینے کے لیے اس نے طرح طرح کی تشبیہیں، استعارے حکمت اور دور بینی کے نکات اور مثالیں پیدا کیں۔ افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے جو مثالیں دی ہیں وہ بعض مقامات پر برجستہ نہیں ہیں اور نہ ان کا مفہوم صحیح پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً انھوں نے ایک شعر پیش کیا ہے۔

معجزۂ اہل فکر فلسفہ و پیچ پیچ ؛ معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

اس شعر کا پہلا مصرعہ ان کے مفید مطلب ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اقبالؔ نے عمل، یقین اور عشق کے متعلق پیغام پر زور دیا۔ جس کے مظہر حضرت موسیٰ ؑ ہیں اور ان کا تعلق فرعون و طور سے ہے۔ پیغمبر، اقبالؔ کے نزدیک خودی، عمل یقین اور عشق کا مکمل نمونہ ہوتا ہے۔ فاضل مصنّف نے دوسرے مصرعہ کی قوت کا اندازہ نہیں کیا اور نہ اس کا ذکر کیا۔

اسی طرح اقبالؔ نے عمل اور خودی کی قوت کو اکسانے کے لیے فلسفۂ شاہین" کی دلچسپ تشبیہہ پیدا کی۔ عقل کو غلام، عشق کو امام، علم کو پوست، عشق کو مغز، جنوں کو، جو عشق کی ایک والہانہ کیفیت ہے علم سے زیادہ تیز رو بتایا۔ بہر حال جس موقعے پر جس مسئلے کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت ہوئی وہاں حسن کمال کے ساتھ اس پر زور دیا گیا۔ مثلاً:

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی

اس شعر میں عقل اور عشق کی ناتمامی اور بے راہ روی پر افسوس کیا ہے۔

یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مصنّف کے پیش کردہ اس شعر میں، جیسا کہ میں نے کہا خودی کو عقل و دل دونوں کے لیے موزوں قرار دیا گیا ہے ؎

جانے کہ بخشند دیگر نگیرند
آدم بمیرد از بے یقینی

اس شعر میں یقین کی قوّت دکھائی گئی ہے۔

نشان راہ ز عقل ہزار حیلہ مپرس بیا کہ عشق کمالے ز یک فنے دارد

اس میں عقل پر مکمل اعتماد کو باطل قرار دیتے ہوئے عشق کے کمال کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس طرح مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہزار طریقوں سے اقبالؔ نے اپنے پیغام کے ان چار عناصر کو روشن اور موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ سارا پیغام کالعدم ہو جاتا اگر ان عناصر میں توافق باہمی کے بجائے تصادم باہمی کیا جاتا یا ایک کو دوسرے کا حریف گردانا جاتا لیکن بہ نظر غور دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبالؔ نے ان کے مدارج اور فوقیت کا ہر منزل پر خیال رکھا ہے اور جو واسطہ اور رابطہ ایک کو دوسرے سے ہے ان کی ترتیب اور مقام کا پورا پورا

لحاظ رکھا ہے۔ فاضل مصنف اس مقام پر غور و فکر سے کام لیں تو مناسب ہو۔

آخر یہ بتانا مناسب ہوگا کہ

۱۔ اقبال کی کمال شاعری اور اس کی قوت تخلیق اس کے علم سے متاثر ہوئی۔ ایک تو "العلم حجاب الاکبر" دوسرے اس کے خیالات میں اس کے مطالعہ اور مشاہدہ کی وجہ سے دوسروں کے خیالات کی اس قدر پرچھائیاں آگئیں کہ اس کے اکثر خیالات کسی نہ کسی گزشتہ بڑی شخصیت میں خواہ غزالی ہو یا برگسان تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ اس مقام پر یہ کہنا کہ یہ خیال غزالی کا ہے نظریہ برگسان کا ہے۔ اس لیے نامونوں ہے کہ اقبال نے بالارادہ اپنے خیالات کو اس طرح منظم نہیں کیا کہ وہ ان کے معلوم ہوں یا نہیں مخاطب کیا جائے۔

۲۔ اقبال نے اپنے کلام میں حقائق پیش کرنے کی کوشش کی اور ظاہر ہے کہ حقائق نئے نہیں ہوتے، شاعر جن حقائق کو پیش کرتا ہے وہ تو زندگی میں گھلے ملے ہوتے ہیں۔ بہت ممکن ہے۔ نیوٹن، آئن اسٹائن یا اڈیسن دنیائے سائنس میں نئے انکشافات کریں لیکن زندگی اور جذبات کی دنیا میں حقیقت جانی پہچانی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اقبال کی "من کی دنیا" کوئی نئی چیز نہیں، خود کوئی نئی بات نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتی ہے؟ اس لیے اس مفروضہ یا تصور ما قبل کے ساتھ کہ اقبال ایک فلسفی تھا۔ نئی چیزیں پیش کرتا۔ انتہائی اور عجیب شاعر تھا، معلم تھا۔ اس کے کلام کا مطالعہ کرنا خواہ مخواہ غیر ضروری صفات کا اضافہ کرکے اس کے کلام کو مشکل تر بنا دینا ہے۔

جہاں تک اس کے پیامات شاعرانہ کا تعلق ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ واقعہ الٹا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے بعض نظریات کو واضح کرنے کے لیے انھیں نثر کے خشک قالب میں ڈھالنے اور ان کی شرح کرنے کی کوشش کی۔ اس کے برعکس اگر اس نے اپنی تقریروں میں شعور، ارادے، سنجیدگی اور غیر جذباتی طریقے سے بیان کیے ہوئے جذبات کو شعر کا لباس پہنانے کی کوشش کی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خیالات اور نظریات من و عن اسی طرح شعر میں منتقل ہو گئے ہوں جس طرح نثر میں ہیں شاعری کی ایمائیت (Suggestive-ness) اثر اور وجدان کو روکنا جس کے ذریعہ اصل خیال کچھ سے کچھ بن جاتا ہے اور نئی تاثیر پیدا کر لیتا ہے۔ خود شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اقبال خود نہیں جانتا کہ اس کے مقالوں میں ظاہر کیے ہوئے خیالات اس کے شعر میں جلوہ گر ہو کر ہم پر کیا اثر کر رہے ہیں۔ ⊙

اقبال کے الہامی تصورات

حضرت اقبال نے خدا سے یہ دعا کی تھی:

من کہ نومیدم ز پیران کہن ⁂ دارم از روزے کہ می آید سخن
بر جواناں سہل کن حرف مرا ⁂ بہر شاں پایاب کن ژرف مرا

جوانوں کو سوز جگر بخش دے ⁂ مرا عشق، میری نظر بخش دے

آج اگر ہم اقبال کے خونِ جگر سے سینچے ہوئے خیالات، اور طویل راتوں میں عالم غیب سے حاصل کیے ہوئے تصورات کی قدر کرنا چاہتے ہیں، تو ہمیں ایک کام یہہ کرنا چاہیے کہ ہم اقبال کی پاکیزہ تعلیمات کو آسان سے آسان کر کے نوجوانوں میں پھیلائیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اقبال کو سمجھنے اور سمجھانے کا دعویٰ کر سکتے ہیں، کیونکہ پروفیسر نکلسن جیسے فاضل نے خود یہ کہا ہے کہ اقبال کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ تاہم میں کوشش کروں گا کہ اقبال کے الہامی تصورات میں سے چند کو آپ کے مطالعے کے لیے واضح طریقے پر پیش کروں۔ میں اپنی تشریح میں حضرت اقبال کے اشعار کی مثالیں کم پیش کروں گا کیونکہ اقبال کے کلام سے کم و بیش ہر شخص واقف ہے، اور سمجھ سکتا ہے کہ میں کن امور کی طرف اشارہ کر رہا ہوں اور ان کی مثالیں کہاں مل سکتی ہیں۔

میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا عقیدہ ہے کہ اقبال کی تعلیمات کے بعض حصے الہامی ہیں،

لیکن ہمیں الہام کے معنی سمجھ لینے چاہییں۔ الہام کو عام طور پر کوئی اشارہ یا کوئی ایسی بات سمجھا جاتا ہے جو عقل اور ارادے کے بغیر حاصل ہو۔ جس شخص پر الہام ہوتا ہے اسے کسی غیبی قوت کے تابع سمجھا جاتا ہے۔ شاعر اپنے آپ کو روح القدس کا ہمزبان سمجھتا ہے۔ لیکن علمی نقطۂ نظر سے اس کی تشریح ایسی بے ربط نہیں ہے۔ الہام کے قبل انسان کا تین حالتوں سے گذرنا ضروری ہے۔ ایک، دورِ شک، خواہش و فکر، دوسرے، دورِ سکون واجماع اور تیسرے، دورِ تخیل، گویا الہام کے تین عناصر ہیں، خواہش، سکون اور تخیل۔ (مذہبی الہام پر مشہور نفسیات داں پروفیسر جمیل نے عمدہ بحث کی ہے) اس کے بعد آپ کو یہ معلوم کرنا ہے کہ الہام کے معنی کسی سچائی یا حقیقت کا نفس تحت الشعور سے جست کر کے عقل اور شعور کی سرحد میں آجانا ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض اعمال کسی خاص اثر کے تحت ایسے ہوتے ہیں جو بظاہر خیال اور اندازے کے تابع نہیں معلوم ہوتے، لیکن وہ صحیح ہوتے ہیں۔ اور عظیم شخصیتوں پر ہی یہ کیفیت بہت شدید ہوتی ہے۔ الہام کی یہ بہت عام اور سرسری سی تشریح ہے، لیکن ہمارے لیے اتنا کافی ہے۔ تصورات کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ تصور خیال اور اس کی شبیہ سے مرکب ہوتا ہے۔ شاعر عقل اور الہام کے ذریعے دور کے مضامین کی ایک دھندلی سی تصویر دیکھتا ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اقبال نے اپنی شاعرانہ اور مفکرانہ زندگی میں دور کی کیا تصویریں دیکھیں اور انھیں زندگی سے کس طرح مربوط کر دیا؟

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ حضرت اقبال نے اس عقل پرست اور علوم دماغی سے مسرور ہونے والے زمانے میں انسان کامل کی جستجو کی اور یہ سمجھایا کہ انسان، ساری دنیا تو خیر، ساری کائنات میں سب سے بڑا درجہ رکھتا ہے۔ جس انسان کو دنیا دولت پیدا کرنے کا آلہ یا صرف عقل کی باتوں کو حاصل کرنے والا ایک مرد سمجھتی ہے، وہ دراصل حاکم ہے، کائنات میں اس کا درجہ سب کو اپنا محکوم بنانے والے کا ہے۔ جہاں آپ نے خلافت آدم کے عنوان کے تحت عظمت انسانی کا راز سمجھایا ہے، وہاں اس کا خلاصہ دو شعر میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

آنچہ در آدم بگنجد عالم است
آنچہ در عالم نہ گنجد آدم است
برتر از گردوں مقام آدم است
اصل تہذیب احترام آدم است

آدم کو ساری کائنات پر فضیلت یہ ہے کہ جہاں آدم کا وجود ہے وہاں عشق کا ایک راز موجود ہے۔ انسان کے اندر علم کا آغاز، ہوتا آدمی شعور حاصل کرتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ ح

فردہ فردہ غیب آور گردد حضور

کے تحت اس کا علم، عرفان اور عرفان عشق میں مبدل ہو جاتا ہے۔

آدمی کی عظمت کا دوسرا راز یہ ہے کہ اس میں ذوق تخلیق ہے۔ وہ چیزوں کو بناتا پیدا کرتا اور ان سے کام لیتا ہے۔ علم اور عشق، اسی ذوق تخلیق کے ذرائع اور زندگی کے دو ابتدائی اور انتہائی مقامات ہیں۔

علم از تحقیق لذت می برد ٭ عشق از تخلیق لذت می برد

صاحب تحقیق را جلوت عزیز ٭ صاحب تخلیق را خلوت عزیز

انسان مرد حق بن کر لا یراعی ولا یخاف پر کاربند ہوتا ہے۔ نہ وہ کسی کی رعایت کرتا ہے اور نہ کسی سے خوف کرتا ہے۔ انسان ارض خدا کا مالک ہے جو شرق سے غرب تک ہے۔

یاد رہے کہ یہ بہت بڑا پیغام ہے جو دنیا کو دیا گیا ہے۔ لیکن اقبال نے عظمت انسانی کا صرف ادعا ہی نہیں کیا بلکہ یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ انسان اپنی عظمت کا راز کس طرح سمجھ سکتا اور کس طرح حاصل کر سکتا ہے۔ اس بنیادی نظریئے کو سمجھانے، اور انسان کامل کی تلاش میں اقبال نے اپنا فلسفہ خودی، یقین اور عمل پیش کیا۔

خودی کے تین اجزا ہیں :۔

(۱) قوانین اور احکام یعنی ضابطۂ حیات کی اطاعت اور ضبط نفس یعنی جو جبلتیں فطری طور پر زندگی کو سنوارنے کے لیے لازمی ہیں، ان کو شکست توڑنے کی کوشش نہ کرنا

(۲) یعنی ناجائز خواہشات کی روک۔

(۳) نیابت الٰہی کا تصور پختہ عقیدہ اور ایمان پیدا کرنا، کہ ہماری روح میں غیر معمولی قوتیں ہیں، اور ان سے کام لینے کے طریقے معلوم کرنا۔ اس میں خودی کا آخری تصور الہامی ہے۔

فلسفہ یقین اور فلسفہ عمل کے متعلق واشکوٹ سمویل نے بڑی عمدہ باتیں بیان کی ہیں۔ اس کے خیالات اور اقبال کے فلسفہ یقین اور عمل میں جو باتیں مشترک ہیں، وہ کچھ اسی قسم کی ہیں۔ یقین اپنے جذبات اور تصورات کو کسی ایک بات پر جمع کرنے کا نام ہے۔ لیکن اس جمع کرنے سے ہوتا یہ ہے کہ بالآخر وہی بات آگے چل کر ہمارے اندر

قوت محرکہ پیدا کرتی ہے، جو عمل کی مبدا ہے۔ خدا پر یقین رکھنا گویا اپنے شعور میں انقلاب اور اپنے اندر قوتِ محرکہ پیدا کرنا ہے، جو زندگی کا جوہر حقیقی ہے۔ عمل ایک جدوجہد مسلسل ہے اس سے انسان اپنے تصورات کو واقعیت کے لباس میں جلوہ گر دیکھتا ہے۔ انہیں پہچانتا ہے، اور دوسرے تصورات کی طرف بڑھتا ہے۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقین پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

●

عمل سے زندگی بنتی ہے، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے، نہ ناری ہے

یہ تلقین اس زمانے میں اس لیے بھی اہم ہے کہ ہم ذہنی علوم سے پیدا شدہ شک میں مبتلا ہیں اور ادب تشکیک سے بہت متاثر اس طرح معلوم ہوا کہ حضرت اقبال نے انسان کو خودی، یقین اور عمل کے ذریعے اپنی قوتوں کو بلند کرنے اور انسان کامل کی منزل تک پہنچنے کی الہامی تلقین کی۔

(۲) اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عملاً انسان اس درجے تک پہنچ سکتا بھی ہے یا نہیں؟ حضرت اقبال فرماتے ہیں کہ پہنچ سکتا ہے۔ ان کے دو الہامی تصور، ان کے اس عقیدے کی تائید کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان کی روح اور زندگی ارتقائی ہے اس میں ہر آن، ہر لحظہ، بڑھنے، پھیلنے اور خدائی قوتوں کی طرح کائنات پر حکومت کرنے کی صلاحیتیں ہیں۔

(۳) اس ارتقائی قوت کو انسان غلط راستوں پر چل کر بہت کمزور کرتا ہے، لیکن قدرت اپنی طرف سے اس کی برابر تائید کرتی ہے۔ جاوید نامے میں روح کے اس ارتقاء کو عجیب و غریب طریقے سے سمجھایا گیا ہے۔ روح رومی جب نمودار ہوتی ہے تو حضرت اقبال اس سے مختلف سوالات کرتے ہیں۔ ان میں تین اہم منزلیں ہیں:

(۱) مقصد حیات کیا ہے (۲) روحانی ارتقاء کس طرح حاصل کر سکتا ہے (۳) عدم و وجود کسے کہتے ہیں۔ ہماری موجودہ بحث کا تعلق دوسرے سوال سے ہے یعنی انسان روحانی ارتقا کس طرح حاصل کر سکتا ہے! اس کا جواب حضرت رومی نے جو عطا فرمایا اس کی آسان شرح یہ ہے؛

پہلے یہ معلوم کر لیجیے کہ روحانی ارتقاء کی تین اہم منزلیں ہیں:

(۱) ایک پختہ عقیدہ اور ایمان

(۲) ایک عجیب منظر جسے ہم موت کہتے ہیں (ڈاکٹر رضی جیسے قابل فرزند عثمانیہ نے اس کی شرح خوب کر دی ہے (۳) عشق۔

مولانا روم فرماتے ہیں کہ حیات یں سفر دری ہے کہ انسان پہلے اپنی منزل متعین کرے اور وہ منزل کبریائی اور سلطانی ہے ایہ آپ فرماتے ہیں کہ آیۂ کریمہ الا بسلطان کو یاد کرنا اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔ وہ آیۂ کریمہ یہ ہے۔

یٰمعشر الجن والانس ان استطعتم ان تنفذوا من اقطار السمٰوٰت والارض فانفذوا لا تنفذون الا بسلطٰن ٥

اے گروہ جنات اور انسان، اگر تم میں زمین اور آسمان کے حدود توڑ کر نکل جانے کی قوت ہو تو نکل جاؤ۔ تم نہیں نکل سکتے مگر زور اور طاقت کے ساتھ

خدا ایک نور ہے، ایک قوت ہے، اگر ہم اس قوت کے ساتھ ربط پیدا کرلیں، تو اس کی رو ہمارے اندر بھی دوڑ سکتی ہے، نفس، سانس اور روح کے ذریعے بجلی کے تاروں کا انتظام پہلے سے موجود ہے۔

موت کے متعلق مولانا نے سمجھایا ہے کہ یہ دراصل فنا نہیں، بلکہ بقا کی پہلی منزل ہے۔ یہ ایک قسم کا زادن دیگر یا نیا جسم ہے؟ جس طرح انسان پہلے عالم سے ماں کے شکم میں آیا اور اس دنیا میں پیدا ہوا اسی طرح انسان اس دنیا کے پیٹ میں جا کر شکست عالم کے بعد کسی اور عالم میں پہنچ جائے گا۔

زادن طفل از شکست اشکم است
زادن مرد از شکست عالم است

اس میں بھی دو کیفیتیں ہیں:

(۱) انسان مجبوری کے ساتھ اس عالم میں پیدا ہوا، لیکن اپنے اختیار کے ساتھ کامیاب اور خوشی اس عالم سے دوسرے عالم میں جا سکتا ہے۔ وہ اپنے ایمان اور عشق کے ذریعے آب و گل کی سرحدیں توڑ سکتا اور عناصر کے اس زندان چہ کو توڑ کر عالم بالا کی طرف بال فشاں ہو سکتا ہے۔

(۲) اگر انسان نہ کر سکے تو ایک دن قدرت خود اس عالم کو شکست دے دے گی، اس کے دامن

سے گر د حیات رحل جائے گا اور یہ عالم بھی نہ رہے گا. جہاں انسان اپنی حقیقی عظمت سے کام لینے میں کوتاہی کر رہا ہے۔

حضرت اقبالؔ نے اسی طرح سخر لکم ما فی السموات وما فی الارض کی دوسری آیت بھی سمجھائی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی قوتوں کے ذریعے زمین اور آسمان کی ہر شے کو اپنے قابو میں لا سکتا ہے۔ حضرت اقبالؔ صاف طور پر فرماتے ہیں کہ اے انسان، تو سراپا دیدہ ہے۔ تو نظر پیدا کر، پھر تجھے تو آسمانوں کے پردوں، اور کائنات کی وسعتوں سے ڈرنے کی ضرورت نہ ہو گی زمان و مکان پر نظر ڈال تو تجھے معلوم ہو کہ جان کے سامنے دونوں برابر نہیں تو لیل و نہار کے اختلاف میں اسیر ہے، لیکن تجھے کیا معلوم ہے کہ تیری روح ایک تخم کی طرح ہے، جو تیرے جسم کی زمین میں اُوگتی اور پھیلتی پھولتی ہے۔ مغرب نے اس سوال پر جو تحقیقات کی ہیں وہ دل چسپ ہیں، لیکن یہاں ان کے ذکر کا موقع نہیں ہے۔

(۳) اب حضرت اقبالؔ کا پہلا سوال ہمارے پیش نظر ہے۔ مقصد حیات کیا ہے؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب تلاش کرنے میں دنیا آج تک سرگرداں ہے۔ اگر یہ صحیح طور پر حل ہو جائے تو یہ سمجھنا غلط نہ ہو گا کہ دنیا کے کاروبار ہی بند ہو جائیں گے. حضرت اقبال نے الہامی نگاہ سے اس وقت اور فنا کا عالم دیکھا ہے جبکہ مقصد حیات کی تکمیل ہو چکی ہے اور یہ عالم شکست پا چکا ہے۔ جس دن انسان نے یہ مقصد حاصل کیا اس دن نہ تو یہ عالم اس کے قابل رہے گا، اور نہ یہ انسان اس کے قابل۔ مقصد حیات کا جوہر یہ ہے سما۔

بر مقام خود رسیدن زندگی است
ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
مرد مومن در نسازد با صفات
مصطفیٰ راضی نہ شد الا بذات
زندگی اے زندہ دل دانی کہ چیست
عشق یک بین در تماشائے دوئی است

اسی شعور باطن کو حاصل کرنے کی تڑپ عشق کی پہلی جست ہے، اور اسی کی انتہا کو معراج کہتے ہیں۔

چیست معراج آرزوے شاہدے

امتحانے رو بروے شاہدے

زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے صحیح مقام عظمت تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ پروفیسر الگزنڈر کی زبان میں لوگ یہ دعوے کرکے رہ گئے ہیں کہ، "اگر ہم خدا کو پہچاننا چاہیں، تو اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہم خدا بن جائیں۔" لیکن خدا کس طرح بن جائیں؟ اس کا جواب نہ مل سکا۔ حضرت اقبال نے مقام ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے الہامی انداز سے خدائی حاصل کرنے کے طریقے بتلائے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ انسان غفلت کے پردے چاک کر کے ذات کو بے پردہ دیکھنے کی سعی کرے۔ چونکہ انسان خلافتِ الٰہی سے سرفراز ہوا ہے اس لیے خدا کا جلوہ خود اس کی ذات میں نظر آسکتا ہے۔

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ یار
جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

اصل مقصود کو اس جگہ تلاش کیوں نہ کیا جائے جہاں اس کا مسکن ہے۔ برق، باد، لاشعاع اور ریڈیو، عقل اور سیاست کی وادیوں میں مدتوں سرگرداں رہنے سے فائدہ، شارٹ کٹ خود اپنا روح انسانی ہے۔

انسان جب شعور حاصل کرنا چاہتا ہے، زمان و مکان سے گزر کر ذات الٰہی کے نور کو معلوم کرنا چاہتا ہے تو اسے زندگی کی تعریف اس طرح کرنی پڑتی ہے۔

زندگی خود را بہ خویش آراستن
بر وجودِ خود شہادت خواستن

خدا نے بھی روز الست میں ایسی شہادت طلب کی اور اپنے وجود کی گواہی کے لیے یہ عالم بنایا۔ انسان کو چاہیے کہ اس کی پیروی کرے اور اپنے وجود کے لیے شہادت کی تین منزلوں سے گذرے یا تین گواہ طلب کرے۔

(۱) اپنا شعور، یعنی اپنے نور سے اپنے آپ کو دیکھنا

(۲) اپنے آپ کو دوسرے کے نور سے دیکھنا۔

(۳) اپنے آپ کو سر ذاتِ حق کے نور سے دیکھنا۔ جب انسان ان تین منزلوں سے گذر جائے گا تو

وہ لافانی ہو جائے گا۔

پیش ایں نور ار بمانی استوار

حی و قائم چوں خدا خود را شمار

ہر کہ عاشق شد جمال ذات را

اوست سید جملہ موجودات را

یہی وہ قوت ہے جس کا دنیوی نقشہ نطشے نے کھینچا ہے۔

حضرت اقبال کا تیسرا سوال کہ وجود و عدم کیا ہے، اس وقت زیر بحث نہیں آ سکتا پھر کبھی اس پر قلم اٹھایا جائے گا۔

آخری مطلب پر مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ موجودہ زمانے کی روح کو حضرت اقبال نے الہامی قوت کے ساتھ دیکھا ہے۔ انہوں نے خوب سمجھا کہ موجودہ دور کی خصوصیت عقل کی بیداری یہ ہے۔ لیکن

عصر حاضر را خرد زنجیر پا

جان بیتابے کہ من دارم کجا

اس لیے آپ نے انسان کامل کی تعمیر کے لیے ایک طرف عقل کو ضروری قرار دیا، دوسری طرف عشق کو، اور اگر آپ بانگ درا کی ابتدائی نظم عاشق ہرجائی — ہے عجب مجموعہ اضداد اے اقبال تو — سے لیکر ارمغان حجاز تک حضرت اقبال کے الہامی پیغام پر غور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ عقل اور عشق دونوں راستوں کو ایک دوسرے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔

عقل است غلام من، عشق است امام من

گو وہ عقل کو معذور سمجھتے ہیں، عشق کے مقابلے میں، لیکن اسے کالعدم قرار نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ترک فکر سے عقل مرجاتی ہے، اور ترک ذکر سے قلب مردہ ہو جاتا ہے جو عشق کی جلوہ گاہ ہے۔

ہمیں صاف اور واضح طریقے پر اس لفظ عشق کے معنے معلوم کرنا ہے۔ پروفیسر نکلسن نے عشق کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ یہ ایک قوت ہے، جو آگے چل کر عالم اجسام پر حاوی آجاتی ہے۔ لیکن خود حضرت اقبال نے اپنے ایک خط میں اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ علم سے انسان کا آغاز ہوتا ہے، اور انتہا عشق

ہو سکتی ہے، جو انتہائی علم و عرفان ہے، اور جہاں انسان عقل کے ذریعے چیزوں کو سمجھتا نہیں، بلکہ محسوس کرتا، اور دیکھ سکتا ہے۔ آپ نے بڑی شدت کے ساتھ عشق کی صفات پر زور دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ عشق ہی خالق کائنات ہے۔ محیط ہے، زمان و مکاں کا حاکم ہے۔ روح انسانی کا مبداء ہے، عقل و عشق آپ کے نزدیک جان اور روح کی ایک صفت سے پیدا ہوتی ہے، جیسے عقل ابتدا ہے، اور جیسے جیسے روح میں تڑپ پیدا ہوتی ہے، جو اس کی فطرت ہے تو عشق غالب آتا ہے۔ عقل کی پہلی تڑپ تجلی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بغیر تجلی کے علم اور زندگی بیکار ہے:۔

بے تجلی زندگی رنجوری است
عقل مہجوری و دین مجبوری است۔

عقل، مذہب، علم، زندگی سب بے کار ہیں، جبتک ان میں تجلی نہ ہو۔

جان ذوقِ نمو کا ایک جوہر ہے۔ ہر آن بڑھنا اس کی شان ہے۔ جان کا نام جذب ہے، سرور ہے۔ سوز ہے اور درد ہے۔ اس کا منصب اعلیٰ ذوقِ تسخیر سپہر گرد گرد ہے۔ جب انسان عقل اور عشق کے مقام سے گزرتا اور شعورِ حقیقی حاصل کرتا ہے تو اس کا مقام سات آسمانوں سے بلند ہوتا اور وہ معراج حاصل کرتا ہے۔

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج انقلاب اندر شعور

جب انسان کے قلب خاکی میں تجلی کی چنگاری پیدا ہو جاتی ہے تو یہ بڑھتے بڑھتے عشق کا شعلہ بن جاتی ہے اس وقت جب ہم اپنی علم کی دنیا کو پلٹ کر دیکھتے ہیں تو معلوم یہ کرتے ہیں کہ ہم عشق کے راستے سے کتنی دور نکل آئے، اور کس قدر جلد آئے۔ حضرت اقبال علم و عشق کے متعلق فرماتے ہیں:۔

علم را اندیشہ می گیرد تمام ∴ عشق را کاشانہ قلب لاینام
علم تا از عشق برخوردار نیست ∴ جز تماشا خانۂ افکار نیست
ایں تماشا خانہ سحر سامری است ∴ علم بے روح القدس افسونگری است
بے تجلی مردِ دانا رہ نبرد ∴ از لکد کوب خیال خویش مرد
عصر حاضر را خرد زنجیر پاست ∴ جان بیتابے کہ من دارم کجاست

از درون ایں گلے بے حاصلے
بس غنیمت داں اگر روید دلے

الحاصل یہ وہ بنیادی تصورات ہیں جنہیں اقبال نے مختلف طریقوں سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے علاوہ اور دوسری باتیں مثلاً سیاست، تہذیب، آرٹ، معاشرت، ان کے مقابلے میں زیادہ عنایت اور بیان کے ساتھ، بیان کی گئی ہیں، لیکن ان کی اہمیت وہ نہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ اقبال نے مشرق و مغرب کی حکیمانہ تعلیمات کے امتزاج سے اپنی ایک الہامی فضا پیدا کی ہے۔ جو شخص اس فضا میں جاتا ہے اسے بھی الہامی جذبات پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ نرے عقل و شعور کے قائل ہیں، وہ اقبال کے ان تصورات کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتے۔ جب دنیا ایسے نئے علم کو حاصل کرے گی جو موجودہ علوم و فنون کا نچوڑ ہوگا اور بقول ہیگل کے مذہب اور آرٹ فلسفے میں ضم ہو جائیں گے، اس وقت ہم اقبال کے ان الہامی خیالات کی زیادہ تشریح و توضیح کر سکیں گے۔ اس وقت انہیں تصورات ہی کا سمجھیے، جنھیں مولانائے روم جیسے عالم باعمل کی زندگی کا سہارا دیا گیا ہے۔ اگر یہ اقبال کے تجربات نہیں ہیں، تو کم از کم رومی کے ضرور ہیں، اور حضرت اقبال نے انہیں پورے وجدان اور سوز دروں کی طرح محسوس کیا ہے۔ یہی اقبال کی عظمت ہے۔ ان تصورات اور خیالات کو ہر طریقے سے قابل عمل نہ سمجھئے یہ دراصل چند نئے پیمانے اور سانچے ہیں جو پیش کیے گئے ہیں۔ دنیا کو بھی ان پیمانوں میں حقیقت کی نئی شراب ڈالنی ہے۔ یہ اقبال کے بعد آنے والی الہامی ہستیوں کے ہاتھوں پورا ہوگا۔ حضرت اقبال نے ہمیں اس امید کی بھی جھلک دکھائی ہے۔

فروغ مشت خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکب تقدیر او گردوں شود روزے

خیال او کہ از سیل حوادث پرورش گیرد
ز گرداب سپہر نیلگوں بیروں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیر او پرخوں شود روزے

مطالعۂ اقبال غلط زاویۂ نگاہ سے

مجنوں نے اپنی کتاب میں ابتداءً اقبال کی عظمت کا بڑے شان دار الفاظ میں تعارف کیا ہے لیکن اسی کے ساتھ بعض اعتراضات بھی کیے ہیں۔ اعتراضات یہ ہیں:

(۱) اردو شاعری میں اقبال پہلی ہستی ہیں جن کو صحیح معنوں میں مفکر کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان کی شاعری کی بنیاد ایک خاص نظام فکر پر قائم ہے۔

ان کے خیالات میں ترتیب و تسلسل، استدلال اور نتیجہ نظر آتا ہے اور ان کے اسلوب میں ایک ربط و ضابطہ ہے"

(۲) ..... اقبال ان لوگوں میں نہیں جو سوچ سوچ کر رہ جائیں یا سمجھ سمجھ کر پچھتائیں اور نہ وہ زندگی کے آلام و صعوبات سے بچنے کے لیے کوئی سستی قسم کا نشکا بناتے ہیں۔ ان کی نگاہیں زندگی پر گہری پڑتی ہیں اور وہ نہایت واضح اور حقیقی نتائج پر پہونچتے ہیں جن کو انھوں نے باضابطہ مرتب کر کے ایک مستقل پیغام کی صورت میں ہم کو دیا ہے۔

اعتراضات یہ ہیں:

(۱) اقبال میں ماورائیت ہے (جو صوف کی طرح کا فلسفہ ہے)

(۲) فراریت گریز اور رجعت ہے۔

(۳) خطرناک "حجازیت" کی تبلیغ پائی جاتی ہے۔

استدلال یہ ہے کہ:

(۱) اقبال جس تصور کو بھی لے کر اٹھتے ہیں وہ اصل اول نہایت بلند وسیع اور تمام دنیائے انسانیت پر محیط معلوم ہوتا ہے لیکن بہت جلد اس وسعت و بلندی سے اس قدر سراسیمہ ہو جاتے ہیں کہ اپنی فکر و نظر کا دائرہ نہایت

تنگ اور اپنے سعی و عمل کو بہت پست کر دیتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ جس عشق کو انسان کا خمیر بنایا گیا ہے وہ محض کسی مرد مومن کا اجارہ کیونکر ہو سکتا ہے اور عشق ایک کائناتی حقیقت ہے اس کو پیر حجاز یا کسی دوسرے عنوان کے قومی یا ملی پیغام کا سنگ بنیاد بتانا کہاں کی دانائی ہے۔

(۲) اقبال کی تنگ نظری اور غلط میلانات کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہاں ایک سبب شاید یہ بھی ہو کہ وہ اتنی بڑی شخصیت کے باوجود ٹھیٹ پنجابی تھے۔ پنجابی فطرتاً صوبائی فرق و امتیاز کا دل سے معترف اور قائل ہوتا ہے

(۳) کبھی کبھی واقعی ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا مسلک انسانیت اور آفاقیت تھا یا سستے قسم کی ملیت اور اسلاف پرستی۔ اس لیے کہ دونوں عنوان کے عناصر اقبال کے یہاں مخلوط اور گڈمڈ ملتے ہیں جن سے ہم کو اکثر یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اقبال کے لیے ان کے افکار و خیالات صاف اور سلجھے ہوئے نہیں تھے۔

(۴) اقبال کا وہ میلان جو حجازیت کے نام سے مشہور ہے ان کی ماضی پرستی اور رجعتا پسندی کا نتیجہ ہے

(۵) اقبال اپنے تخیل کو سیدھے راستے پر قائم نہ رکھ سکے اور ان کی انانیت میں بہت سے غلط تصورات دخل ہو گئے۔

(۶) اقبال کی ماورائیت جو تصوف کی قسم کا فلسفہ ہے اس کی وجہ سے ان کی آفاقیت اور لاوطنیت لامکانیت ہو کر رہ گئی ہے۔

(۷) اقبال کے دل میں ہماری دنیائے آب و گل کیلئے نہ کوئی محبت تھی اور نہ کوئی جذبہ احترام۔

اس دنیا کے امتحانات میں پورا اترنے سے پہلے ماورائے ماہ و انجم میں پہنچ جانا ایک قسم کی فراریت ہے جو اقبال جیسے فکر و عمل شاعر کے لیے زیبا نہیں۔

(۸) اقبال کی آفاقیت اور لاوطنیت نے ایک دوسرا ناگوار عنوان اختیار کر لیا یعنی وہ قوم پرستی اور وطنیت کے دائرے سے نکل کر مذہب و ملت کے تنگ دائرے میں پھنس گئے۔

(۹) "اعلیٰ انسان کو مرد مومن کہنا ایسی بات ہے جو اقبال کے شعر و فکر میں ایک نفسیاتی گرہ ہو کر رہ گئی ہے۔

(۱۰) آخری دور میں اقبال کی شاعری میں ایک ایسا میلان پیدا ہو گیا جو حجازیت سے بھی زیادہ خطرناک ہے اور جس کو ہم عقابیت کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی فاشیت ہے۔

(۱۱) اقبال کی شاعری میں ہم کو بہت سی کمیاں اور ایک سے زیادہ غلط اور مایوس کن موڑ نظر آتے ہیں۔

"یہ وہ غلط راہیں ہیں جن پر اقبال اپنے رجعتی میلان کی طرف جا پڑے۔" وہ اپنے تخیل کی تاب نہ لاسکے اور بہت جلد اس سے منہ موڑ کر بھاگے۔ مجنوں کے تبصرے کی یہ دونوں تصویریں اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں مگر

آخیر میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"اقبال کے متعلق میرے خیالات اس قدر باہم متضاد اور مخلوط رہے ہیں کہ ان کو ترتیب دے کر پیش کرنا آسان کام نہیں تھا۔"

"اقبال کا کلام اور ان کا پیغام ایک صالح اور صحیح فکری صلاحیت رکھنے والے ذہن کو الجھن میں ڈال دیتا ہے اور وہ قطعی فیصلہ نہیں کرسکتا کہ اقبال کو ترقی پسند کہا جائے یا قدامت پرست۔"

ان اعتراضات کا جواب دینے سے پہلے ہم بطور مقدمہ دو امور کا ذکر کریں گے۔

(۱) بلند پایہ حکیمانہ شاعری کی تنقید کا داخلی اقتضا کیا ہوتا ہے۔

(۲) ترقی پسندی کے رجحانات سے نقاد ادب کو صحیح تنقید کرنے میں کیا دشواریاں پیش آتی ہیں؟

داخلی شاعری کی تنقید——

داخلی شاعری، شاعر کے عقائد، مشاہدات ذاتی اور شخصی تجربات کی آزاد ترجمان ہوتی ہے۔ اس کے اسلوب اظہار میں موسیقیت اور ترنم ہوتا ہے تاکہ حسن و اثر میں اضافہ ہو۔

(۱) حکیمانہ شاعری پیش کرنے والے شاعر کے متعلق یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ پہلے شاعر ہے اور دنیا... ...میں کوئی داخلی شاعر ایسا نہیں جس میں ہم آہنگی کے باوجود کچھ (compreasion) نہ ہو۔ مصنف نے جمالیات پر بھی کچھ کام کیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ آرٹ میں حسن اسی سے پیدا ہوتا ہے کہ دو متضاد کیفیتوں میں ایک قسم کی لطیف ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

غالب کہتا ہے:

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری ؎ حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

(۲) حکیمانہ اور داخلی شاعری پر نری منطقیت سے جراحی کا عمل نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا حسن ایک ناقابل تجزیہ کل، ایک لطیف مرکب ہوتا ہے۔ اس کی منطق جداگانہ ہوتی ہے (DRICLE) سچ کہتا ہے کہ (

(کسی آرٹ کے عمل کو نقائص کے اعتبار سے کبھی نہ جانچا جائے)

(۳) ایک بلند فکر اور بلند آہنگ شاعر کے پیغمبرانہ نغموں کی فضا میں وہی نقاد آسکتا ہے جو خود بھی بلند فکر ہو بلندی پر کھڑے ہو کر پستیوں کو رفعتوں کا حریف بنا دینا کوئی صحیح طریقہ تنقید نہ ہوگا۔

(۴) کسی رجحان سے قبل (Pre occupation) یا کسی پہلے سے معین کیے ہوئے تخیل یا داخلی شاعری کو سمجھنے سے بات الٹی ہو جاتی ہے۔ نقاد یہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاعر اس کے نقطہ نظر کے تابع ہے حالانکہ شاعر آزاد ہے۔ نقطہ نظر کا اختلاف داخلی شاعری میں چنداں اہم نہیں اور اس سے شاعری کے حسن و عظمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، داخلی شاعری کے متعلق یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ شاعر ایسا کیوں سوچتا ہے بلکہ یہ دیکھا جانا چاہیے کہ وہ ایسا کس طرح سوچتا ہے؛ صحیح تنقید وہ ہے کہ حتی الامکان نقاد شاعر کا زاویۂ نگاہ صحیح طور پر معلوم کرے اور اسے اس کے مقام سے دیکھے۔

(۵) پیغام کی شاعری اور حکیمانہ شاعری میں ایک ہلکی سی مقصدیت اور ارادیت بھی ہوتی ہے لیکن یہی جسے کانٹ کے مشہور الفاظ میں (purpose without purpose) کہا جا سکتا ہے۔ اسے صرف (purposive) سمجھ کر منطق بگھارنا اس کے حسن آزاد کو تباہ کر دینا ہے۔

ترقی پسند تنقید کا اسلوب اور اس کے عواقب:

(۱) ترقی پسند نقاد شاعری کو کاملاً مقصدیت کا تابع سمجھتے ہیں۔

(۲) وہ شاعری کو ایسی تحریکات سے وابستہ کر دیتے ہیں جو ہنوز متنازع فیہ ہیں اور شاعری بجائے آرٹ کے ایک محکمہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے وہ بہ یک وقت دو ذمہ داریاں اپنے سر لیتے ہیں۔ ایک تحریکات کو جائز ثابت کرنا دوسرے ان کو شاعری میں لازماً شریک کرنے کی تلقین کرنا حالانکہ شاعری میں احساس حیات ارادتاً کم اور خود بہ خود زیادہ پیدا ہوتا ہے۔

(۳) اپنی نثر مزاجی اور منطقیت کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف ان کی نیت میں خلوص جذبات میں جوش اور استدلال میں صحت ضرور ہے لیکن دل یہ نہیں قبول کرتا کہ وہ آرٹ اور شاعری کا آزاد اصول ذوق بھی رکھتے ہیں، وہ حسن اور لطافتوں کو روندتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور اپنے مقصد کے پیچھے ہٹ دھرم نظر آتے ہیں۔

(۴) وہ بیسیوں قسم کی اصطلاحیں، دیسی اور پردیسی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً فاسقیت، اشتراکیت، رجعت، بورژوا

سرمایہ دارانہ نظام جنسی تحریکات اشاعیت وغیرہ اور ان سے ہر قسم کا استدلال کرتے ہیں، لیکن فن تنقید کی اصطلاحوں کا استعمال روا نہیں رکھتے۔

(۵) اسی کے ساتھ وہ محدود اصطلاح کو وسیع معنے پہنانے اور وسیع مفہوم رکھنے والی اصطلاحوں کو محدود معنی پہنانے میں بہت چابک دست واقع ہوئے ہیں۔ مثلاً کوئی کہے کہ آرٹ کا مقصد حسن آفرینی اور بے غرض مسرت ہے تو کہا جائے گا کہ حسن اور مسرت افیونی نشہ ہیں۔ ہر چند ارسطو سے لے کر کروچے تک ہر ادیب اور آرٹ کے نقاد و مفکر نے اس کی تائید کی ہے لیکن چونکہ کارل مارکس اینگلس لینن اور اسٹالین نے اس کی تردید کر دی ہے۔ ہر شاعر ادیب اور آرٹسٹ کا قول مسترد کیا جاتا ہے اور سیاست، معاشیات اور تاریخ کے مفکرین کا ادعا ادب کے لیے بھی مستند گردانا جاتا ہے۔ دلیل یہ ہے کہ ادب زندگی ہے! انھوں نے ادب برائے ادب کہہ دیا اور سمجھ گئے کہ ادب اور آرٹ کا جملہ حسین ..... کوششوں پر پانی پھیر دیا گیا ہے۔ ادب برائے حیات کہہ دیا اور یہ ..... کہ ہر معمولی شاعر یا شاعر کی چند ...... طنزیات کو اعلیٰ ادب کی سند عطا کر دی گئی!

(۶) نقادوں نے اپنی متلون طرز تنقید سے یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ مذہب، اخلاق، ماضی اور اسلاف کی طرف مڑ کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ سکون، مسرت اور فطری خوشی کا اظہار ان کے نزدیک گمراہی محض ہے خدا کا نام ان کے نزدیک محدود ہے جمہور، زندگی، آزادی اور انسان کا نام لامحدود!!
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں قوس قزح کا نظارہ گناہ ہے اور گندگیوں پر خامہ فرسائی ضرورت کے تحت ثواب ہے گویا ادب خارجی ضرورت کی تکمیل کا نام ہے داخلی تقاضا کا نہیں۔ ان کی تنقید دریدہ دہنی کا ایک مظاہرہ ہوتی ہے وہ اس قسم کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں:
پامال فرسودہ گندگی، عفونت، ناسور، غلط، مہلک، خطرناک، تباہ کن، انسانیت سوز گمراہ کن، خوشامدی، افیونی، بسٹرانڈ وغیرہ۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ ان الفاظ کے استعمال سے سنجیدہ تنقید کا لب ولہجہ کتنا گر جاتا ہے، کیا اس مفہوم کو اس غم و غصہ کے ساتھ شائستہ طریقے سے ادا نہیں کیا جاسکتا؟
اب آئیے مصنف کے اعتراضات کی طرف رجوع ہوں۔ مصنف کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں ماورائیت ہے؟ انھوں نے مثالیں نہیں دی ہیں۔ البتہ اعتراضات کی نوعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ

ماورائیت سے ان کی مراد یہ چار امور ہیں۔

(۱) ماورائیت، جہان دیگر کا تصور اور اس کی طرف پرواز کی تلقین۔

(۲) مذہب، خدا، پیغمبر، اولیاء اور مجاہدین کا ذکر قرآن اور احادیث اور حکمائے اسلام کی روشنی میں زندگی کی شرح۔

(۳) اخلاقی اور صوفیانہ تصورات کی تعبیر۔

(۴) مجازیت کی تعلیم جو ایک طرح کی فراریت ہے۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ معترض نے اقبال کی ماورائیت کو صحیح طور پر نہیں سمجھا اور اگر وہ میتھیو آرنلڈ کی نقل کر رہے ہیں جس نے شیلی کی شاعری کو (THE BEATING ITS RINGING) کہا ہے تو یہ کوئی معقول بات نہیں۔

اصولاً اقبال کی ماورائیت کی چار صفات قرار دی جا سکتی ہیں۔

(۱) ایک سفر مسلسل ہے جو دنیائے آب و گل سے منزل کبریا تک چلا گیا ہے۔

(۲) اس سفر کی کئی منزلیں ہیں جن میں کچھ فلسفے کی قوت سے محسوس کی گئی ہیں اور کچھ شاعری کی مدد سے۔

سب سے پہلی شاعرانہ قوت تخیل ہے جو داخلی اور بلند شاعری کے لیے لازم ہے۔ دنیا کا عظیم ترین شاعر تخیل کی تعمیری قوت کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

The poets life in a fine frenzy rolling
Doeth glance from Heaven to earth
And as imagination bodies forth
The forms of things un known the poets pen
Turns them to shapes and gives to airy things
A local habitations name.

یہی بات خود اقبال بھی کہتے ہیں:

کہ شد پردہ چشمم پر کاہے گاہے ۔۔۔ دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

(۳) آرٹ نام ہے تخیل اور جذبے کے مناسب امتزاج کا۔ اقبالؔ نے تخیل کے ساتھ بعض عمیق جذبات اور احساسات سے کام لیا ہے۔ وہ کئی ہیں۔ مثلاً:

مثلاً: (۱) ذوق جستجو (۲) سوز و ساز (۳) یقین (۴) عمل (۵) علم و عرفان (۶) فقر (۷) سادگی (۸) بلند حوصلگی وغیرہ۔

ہیگل نے اعلیٰ آرٹ کی تعریف میں لکھا تھا کہ "شاعری وہ مجسمہ ہے جس کے پاؤں زمین پر ہوتے ہیں اور سر فضائے آسمانی میں بلند ہو کر ربانی تجلیوں کو منعکس کرتا ہے۔" اقبالؔ کی شاعری کا پیکر اسی قسم کا ہے انھوں نے اپنی ماورائیت کو ایک مکمل شریعت حیات (Code of life) بنا کر پیش کیا جس میں جامع طریقہ پر چار امور کی تلقین کی۔

(۱) یقین پیدا کرنا:

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا
آدم بہ میرد از بے یقینی

(۲) عمل اور جہاد حیات:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے!

(۳) خودی کی ترقی

(۴) عشق یعنی کشش و جذب اور حیات سے حقیقی ربط۔

اقبالؔ نے انسانی زندگی کی منزل کے متعلق کہا ہے "منزل ما کبریاست" زندگی کا مقصد ان کے نزدیک ارتقائے مسلسل کے تحت انسان کامل کی تعمیر ہے، علم اس کا آغاز اور عشق اس کی انتہا۔ یورپ نے عقل و علم کو ترقی دی لیکن عشق سے محروم رہا۔ انسان کامل میں علم و عشق دونوں کی حدیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور ان کو ملانے والی کڑی خودی ہے۔

اگر خودی کے تین اجزا سمجھ لیے جائیں تو اقبالؔ کی ماحصائیت کا زندگی سے ربط خوبی کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے ——— یہ تین امور یہ ہیں:

(۱) نیابت الٰہی کا تصور۔

(۲) ضبط نفس

(۳) تسخیرِ کائنات کا عملی احساس جس میں عبادت، اخلاق، جہاد، سائنس کی ترقی، علم و عرفان، سیاست، تمدن، معاشرت، عشق سب شامل ہیں۔

(۴) ما ورائیت کو خالص تصوریت سے بچانے کے لیے اقبال دو قسم کا ٹھوس مواد داخل کرتا ہے۔

(۱) تاریخ کا انقلابی تجربہ جس نے انسان کامل سے استفادہ کیا اور انسان کامل کی تعمیر کی پوری راہیں سمجھا دیں اور جسے اسلام کہتے ہیں۔

(۲) اپنا وجدان اور احساس جو مفکرین اور مجاہدین عالم کے عملی تجربوں، اعلیٰ تصورات اور تجربات سے مربوط ہو——

کہتے ہیں:

خودا فزود مرا درس حکیمانِ فرنگ سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

علم خودی۔ اور عشق کے امتزاج سے، انھوں نے زندگی کے متعلق جو نظریہ قائم کیا ہے اور جو ان کی ما ورائیت کی حقیقی صورت ہے۔ دو مصرعوں میں یوں ظاہر کیا ہے۔

زندگی در صدف خویش گہر ساختن است عشق زیں گنبد دربستہ بروں تاختن است

گویا انھوں نے زندگی کی گہرائی اور بلندی دونوں کو ملا کر ما ورائیت کا ڈھانچہ تیار کیا ہے اور یہ ورڈسورتھ کے مشہور دو اصولوں سے ملتا جلتا ہے مگر اس سے عمیق تر ہے۔

ما ورائیت کی خلا کو زندگی کے عمیق حقائق سے پُر کرنے کے بعد اس سے نری پرواز یا خلا سے تمیز کرنے کے لیے اقبال کے مردِ مومن پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

مردِ مومن ایک اصطلاح ہے۔ ایک نصب العین ہے ایک کردار ہے۔ جو ارتقائے حیات کے سلسلہ میں انسان کامل بنا جاتا ہے۔ جس کی پہلی حرکت انقلاب شعور ہے اور پھر یہ علم خودی، عرفان اور عشق کی منزلیں طے کرتا ہوا اس منزل جنون پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ کہہ سکتا ہے:

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

مردِ مومن کی صفات انسانی بھی ہیں اور مافوق انسانی بھی، وہ بے نیازی، فقر، ریاضت، عقلی ترقی تسلیم و رضا کی منزلوں سے گزر کر روحانی قوتوں کی سرحد میں داخل ہوتا ہے، جہاں تقدیریں نگاہ سے بدل جاتی ہیں۔ اور جہاں خدا بندے سے خود پوچھتا "بتا تیری رضا کیا ہے"۔ مردِ مومن کوئی مولوی یا ملّا نہیں ہے بلکہ اس کی صفات یہ ہیں:۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت ۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
نظر بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز ۔ یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم ۔ جہادِ زندگی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

رہا یہ امر کہ اقبال نے اسے "مردِ مومن" کیوں کہا (اور کسان، مزدور، امامِ جمہور کیوں نہ کہا) اس کا جواب نہ ہمارے پاس ہے اور نہ اقبال کے پاس۔ معترض نے "مردِ مومن" کو صرف مسلمان سمجھ کر یہ اعتراض کیا ہے کہ عشق صرف مسلمان ہی کا اجارہ کیوں ہے؟ اگر مردِ مومن کی مذکورہ بالا حیثیت یعنی "انسانِ کامل" کے اصطلاحی نام کو سمجھ لیا جائے تو یہ اعتراض خود بخود رفع ہو جاتا ہے۔

حجازیت:

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں حجازیت کی تعلیم و تبلیغ ہے، یہاں بھی معترض نے وہی غلطی کی ہے اور "حجازیت" کو اسلامی تعلیم کی حد بندی سے تعبیر کیا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اقبال درحقیقت کسی خاص مذہب کے نہیں بلکہ دینِ فطرت کے قائل ہیں۔ دین اور مذہب کی ان کے نزدیک کیا تعریف ہے انھوں نے . . . . اپنے نثری مضامین اور خطوط سے بھی اسے اچھی طرح سمجھایا ہے۔ لیکن اسلام کا حوالہ وہ اس لیے دیتے ہیں کہ انسانِ کامل کی تعمیر کا ایک تاریخی ثبوت سامنے آجائے۔

یہ سمجھ میں نہ آسکا کہ حجازیت کو اقبال کے نقطۂ نظر سے محدود کیوں سمجھا جائے؟ وہ تو خیال، جذبہ، عمل اور احساس کی اسپرٹ سے بحث کرتے ہیں اور حجازیت کی اسپرٹ کو محدود نہیں سمجھتے۔

معترض "دینِ فطرت" کے ان اصولوں پر ذرا غور فرمائیں:

(۱) ساری کائنات کا ایک نقطۂ آغاز ہے اور مرکزِ تخلیق ہے۔

(۲) ساری انسانیت کی فطرت میں یہ امر داخل ہے کہ وہ مرکز سے وابستہ رہے۔

(۳) سارے انسان بلا امتیاز رنگ و مذہب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

(۴) غریبوں، یتیموں، ہمسایوں، بیکسوں کی امداد، ہر ذی استطاعت پر فرض ہے۔

(۵) ساری زمین خدا کی ہے، خدا کے مقابلے میں سب فقیر اور مفلس ہیں اور خدا بے نیاز ہے۔

(۶) انسان کا وطن سارا کرۂ ارض ہے۔

(۷) زندگی میں مذہب، سیاست، جمہوریت، حریت کے اصول اس وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جبکہ ہر شئے کی بنیاد نیک نیتی، تقوے، خلوص اور محبت پر قائم ہو۔

(۸) عورتوں کی آزادی بھی ویسی ہی قابل احترام ہے جیسی مردوں کی فضیلت۔

(۹) انسان حاکم کائنات کا نائب ہے اور خود بھی تسخیر کائنات کی قوت رکھتا ہے۔

(۱۰) ہر قول و فعل میں سادگی، خلوص نیت کے ساتھ تنظیم اور اجتماعیت ضروری ہے۔

(۱۱) ہر ملک دہر قوم کے رہبروں نے ہدایت و گمراہی کے راستے کھول کر بتا دیئے ہیں۔ سب قوموں کے مقدس جذبات اور ان کے بزرگوں کی تعلیمات کو برا نہ کہنا چاہیئے۔

(۱۲) انسان کی زندگی کا انجام عمل اور ارادے پر ہے۔

(۱۳) اللہ کے بندوں کے درمیان مساوات انصاف اور حریت قائم کرنا چاہیئے۔

(۱۴) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔

(۱۵) تزکیۂ نفس اور ریاضت سے انسان کے لطیف احساسات جلا پاتے ہیں۔ وغیرہ

مجھے افسوس ہے کہ معترض حجازیت کو محض مذہب سمجھ کر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں۔ لیکن کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ان تعلیمات میں کیا خرابی ہے، کون سی خطرناک صورت موجود ہے۔ ان میں آفاقیت اور انسانیت کے خلاف کونسی بات ہے؟

اس سلسلہ میں عقابیت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ معترض کا خیال شاید یہ ہو کہ حجازیت کے ذریعہ عقابیت کی تعلیم بڑی خطرناک بات ہے۔

اقبال نے اپنے ایک خط میں فلسفۂ شاہین کی توجیہ و تشریح کر دی ہے، یہاں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح مزدور، انتقام کا خون اپنی آنکھوں میں لیے ہوئے سرمایہ دار پر جھپٹنا چاہتا ہے، جس طرح

جنسی تحریک ازالۂ گناہ کے لیے اخلاق کے فرسودہ نظام پر حملہ کرتی ہے۔ اسی طرح اقبال کا فطرت پرست آزاد، بے نیاز، بلند پرواز شاہین، غلامانہ ذہنیت رکھنے والے باطل پرست بزدل، حقیقت فراموش اور غلط کار انسان پر جھپٹتا ہے۔ اس کا منشا پر و بال نوچنا یا خون چوسنا نہیں بلکہ انسانِ کامل کی تعمیر کے سامنے آنے والی غلط قسم کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ شاہین اسی اسپرٹ کو ظاہر کرنے کا کنایہ ہے۔

معترض کا مجمل اور آخری اعتراض یہ ہے کہ اقبال کی شاعری میں رجعت پسندی اور فراریت پائی جاتی ہے۔ رجعت پسندی اس لیے کہ وہ مولانا روم کے عقیدت مند ہیں، اسلاف کا ذکر ادب و احترام سے کرتے ہیں تیرہ سو سال پیشتر کی تعلیمات کا اعادہ کرتے ہیں وغیرہ۔ یہ اعتراض اتنا عامیانہ ہے کہ گذشتہ حقائق اور مذکورہ تشریحات کی روشنی میں اس کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی البتہ فراریت کے متعلق ہمیں کچھ کہنا ہے

آج کل یہ اصطلاح دو امور کو پیشِ نظر رکھ کر تراشی گئی ہے۔ ایک یہ جتانے کے لیے کہ محض اور تصورات و مفروضات کی شاعری جس سے حظِ نفس اور حسن پرستی کے پردے میں تعیش، رومانیت اور بیکاری کا پرچار مقصود ہو، جدید ادب نہیں کہلا سکتی۔ دوسرے یہ کہ "ادب برائے ادب" والے مصائبِ حیات سے فرار اختیار کرکے تخیل اور حُسن کی دنیا میں پناہ لیتے ہیں۔ چنانچہ حافظ کی مستانہ شاعری غالب کا علوی تخیل ان کے نزدیک فرار و گریز ہے اس لیے کہ ان میں ایک اچھوتی لطافت موجود ہے۔ جو اس گندی دنیا سے دور ہے۔

اقبال کی شاعری پر فرار و گریز کا الزام بے بنیاد ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کی حرکت و عمل سے آغاز کرکے منزلِ انقلاب سے گزرتے ہوئے منزلِ کبریا تک پہونچتے ہیں اور اس طویل اور وسیع سفر میں جو ازل و ابد کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ دریا کی سی روانی ہے اور ٹھیراؤ کہیں نہیں ہے۔

ہر انسان فطرتاً پست سے بلند، شر سے خیر، بدامنی سے سکون، خزاں سے بہار، بیماری سے صحت کی طرف جانے کی تمنا رکھتا ہے اور خود بہ خود کھنچا چلا جاتا ہے۔ اس لیے میا تھیو آرنلڈ نے شاعر کو قوم کی جائے پناہ کہا ہے۔ نطشے نے خوب کہا ہے۔

Art is with us that we may not perish in truth

سمجھ میں نہیں آتا کہ دریا کا سمندر سے جا ملنا اور انسان کا فطرتاً بلندی، اچھائی اور سکون کی طرف کھنچنا فرار و گریز سے کس طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ یوں تو ہر فطری حرکت، ہر ٹھیراؤ اور ہر اتصال فراریت بن جائے گا۔

معلوم نہیں معترض نے اقبالؔ کی ماورائیت کو فرار کیسے کہا جبکہ اقبالؔ دینوی امتحان میں پورا اُترنے اور ماورا ماہ وانجم جانے کی تلقین کرتا ہے :

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

"بھی کا لفظ" بتا رہا ہے کہ ستاروں کے آگے جو 'جہاں" ہیں وہ اس جہان آب وگل سے مربوط ہیں ۔

معترض جانتے ہیں کہ اقبال نے انقلاب اور کشمکش حیات کے لیے مزدور، کسان، انقلاب، اشتراکیت، آزادی عمل، جہاد جیسے عنوانات پر کیسی بلند پایہ نظمیں لکھی ہیں اور ان تمام نظموں کا ایک عام عنوان یہی ایک ہو سکتا ہے ۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم   جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں!

(غنائیہ)

اقبالؔ

بروں زیں گنبدِ در بستہ پیدا کردہ ام راہے — کہ از اندیشہ برتر می پرد آہِ سحرگاہے
پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند — جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

(اقبالؔ)

[یہ غنائیہ، نظر اور خیال کا ایک سفر ہے جو کلامِ اقبالؔ کی روشنی میں بارگاہ تجلی تک کیا گیا ہے۔ اس میں میں نے اقبالؔ کے چند خاص تصورات اور ان کا مقام دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ اقبالؔ کو دیکھنے اور دکھانے کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں۔ میں نے ان میں سے وہی پہلو لیا ہے جسے میں سب پر حاوی اور اہم سمجھ سکا۔ یہ غلط نہیں کہ فکرِ اقبالؔ کی گہرائیوں تک پہنچنا دشوار ہے۔ یہ شاید توفیقِ ازلی تھی کہ ایسے نازک موضوع پر سب سے پہلے مجھے غنائی تمثیل لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میری اس سعیٔ "دشوار پسند" پر رائے زنیاں ہوں گی، لیکن اقدامِ اولیں کی دقتوں سے قطعِ نظر، اگر اس میں ناظر کو شاعرِ مشرق کا پیام نظر آجائے تو مجھے بڑا اطمینان ہوگا]

پہلا منظر

میلادِ آسمانی

(جنت کے ایک رنگین ترین حصہ میں جہاں شاعروں کی روحیں اپنے بلند تخیل اور دلی تمناؤں کو پھولوں کی طرح کھلتا ہوا دیکھتی ہیں اور ان کی آزادی کے ساتھ آبیاری کرسکتی ہیں۔ غالب کی روح ایک بلند مقام پر کھڑی ہوئی مسرور نظر آرہی ہے اور اپنے آپ سے کہتی ہے)

روحِ غالب: بود ایمانِ تصور مری یزداں نگہی — برقِ طوفانِ تجلی ہے مری پروازِ خیال
آج آشفتہ ہوئے گیسوئے شبگونِ فراق — آج بیتاب ہوا شاہدِ رنگینِ وصال
قابلِ رشک ہے اندازِ جنوں کا انجام — ہوگیا جنت اسرار بیابانِ خیال
سجدہ ریزی میں ہے مصروف مری لوحِ جبیں — محوِ آئینۂ فردا ہے مرا ذوقِ جمال

ایک فرشتہ: ہمرہ طائرِ سدرہ ترے ارمان بلند — رنگ بیتابیِ فطرت ترے دل کے احوال

دوسرا فرشتہ: بحرِ فردا پہ مچلنے لگی تیری امید — بھر گیا بادۂ الفت سے ترا جامِ سفال

(جنت کے پھولوں کا ایک خوش نما گلدستہ ہاتھ میں لیے ہوئے روحِ حالی آتی ہے اور غالب کو پیش کرتی ہے)

روحِ حالی: میرے اشکوں نے دیا تھا جسے اک رنگِ نمو — اس گلستانِ تمنا میں بہار آئی ہے
خشک تھی وادیِ ناآشنا محبت کی زمیں — آج اس دشت پہ گھنگور گھٹا چھائی ہے
ارمغاں یہ اسی گلزار کا لایا ہے غریب
آپ کے ہاتھ میں بیدار ہوں اور اس کے نصیب

(سامنے سے گوئٹے کی روح ایک عجیب و غریب شیشہ سنبھالے ہوئے گزرتی ہے۔ اس میں چند حسین جلوے نظر آتے۔ بعض انسان، بعض پھول، بعض پریاں، بعض ستاروں اور چاند سے ملتی جلتی ہیں۔ کبھی کبھی ایک عجیب و غریب شکل بھی اس میں سے جھانکتی ہے۔ چلتے ہوئے گوئٹے کی روح غالب کو دیکھ کر مسکراتی ہے)

گوئٹے کی روح: جامِ افلاک میں رقصاں مری صہبائے نظر — فرشِ انجم پہ درخشاں مری مخلوقِ خیال

عشق نے توڑ دیا بندِ نقابِ ماضی — آج رنگیں نظر آتا ہے سراپردۂ حال

(اتنے میں حافظؔ اور عراقیؔ کی روحیں ہاتھ میں ہاتھ ملائے ہوئے آتی ہیں۔ گوئٹے کی روح ان کے لیے تھوڑا سر جھکاتی اور گذر جاتی ہے)

حافظ : دوش دیدم کہ ملائک درِ میخانہ زدند — گلِ آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

عراقی : نخستیں بادہ کاندر جام کردند — ز چشمِ مستِ ساقی وام کردند
چو خود کردند راز خویشتن فاش — عراقی را چرا بدنام کردند

(اس گلشن سے دور ایک چٹان پر ورجلؔ اور دانتےؔ کی روحیں کھڑی ہوئی باتیں کر رہی ہیں۔ ان کے مایوس چہروں پر بھی خوشی کی ایک لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ غالبؔ اور حالیؔ یہ نظارہ دیکھتے ہوئے گذرتے ہیں۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں ایک وسیع میدان ملتا ہے۔ اور اس میں ایک بلند فصیل نظر آتی ہے۔ اس پر دو روحیں چڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک شوپنہارؔ اور دوسری حکیم نطشےؔ کی ہے۔ دونوں کچھ تھکی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان کے چہروں پر غیر معمولی شگفتگی ہے)

شوپنہار کی روح۔ مستیٔ عقل و ہوش سے گرمیٔ شش جہات ہے — میرا جنون و بیخودی زینۂ کائنات ہے
وہم وجود ہے نقابِ فطرتِ بے نیاز کا — مرحلۂ حیات پھر مرحلۂ حیات ہے

نطشے کی روح (گنگناتی ہے)

لذتِ وہم وگماں چھلکی ہے غم خانوں میں — گونج اٹھا نغمۂ غم میرے صنم خانوں میں
میری بے باکیٔ افکار نے ڈالے رخنے — دہر کے خالق و مخلوق کے افسانوں میں
شکر ہے چھائے گا اک شاعرِ بیتاب کا رنگ — زندگی آئے گی کچھ دہر کے ویرانوں میں

(غالبؔ اور حالیؔ کی روحیں ایک ایسے مقام پر پہنچتی ہیں جہاں سیکڑوں قسم کی روشنیاں جگمگا رہی ہیں۔ سارا باغ عالی شان ایوانوں سے مزین ہے۔ سامنے خوب صورت پہاڑ اور وادیاں نظر آتی ہیں۔ اتنا سایہ دار مقام کہ روح کو نیند سی آنے لگتی ہے چشموں میں بجلیاں بہتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ نور کے آبشار نگاہوں کے سامنے گرتے ہیں۔ باغ کی ایک زرنگار محراب سے پیرِ رومی زرتاج پہنے ہوئے نکلتے ہیں۔ یہ اقبالؔ کا ہاتھ تھامے ہوئے فرشتوں کے آگے چل رہے ہیں۔ پیچھے فرشتوں کا نغمہ رہتا ہے)

فرشتوں کا نغمہ۔ نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خودگرے، خود شکنے خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستان ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

(پیام مشرق)

دوسرا منظر:

کوہ ہمالہ

(کوہ ہمالہ کی سر بہ فلک چوٹیاں کہر اور بادلوں کا ایک پرشکوہ نقاب ڈالے ہوئے ہیں۔ زور کے جھکڑ چلتے ہیں اور چوٹیوں سے برف پھسل پھسل کر گرتی ہے۔ دور بلند قامت چنار کے درخت عمیق وادیوں میں جھومتے ہیں۔ کہر، بادل، برف اور چنار اپنا اپنا حال دل بیان کرتے ہیں)

کہر۔ اس نیلگوں فضا میں سردی جمی ہوئی ہے
یا چتر آسماں کو جھالر لگی ہوئی ہے
اک وحی زندگی ہے رنگ نزول میرا
شاید پیام ہستی ہوگا قبول میرا

بادل۔ کتنا اُجلا ہے مرا ذوق تجلی یارب
ماہ و خورشید بناتے ہیں مجھے اپنی نقاب
ایک پیمان تسلی ہیں مرے اشک حزیں
ایک طوفان تماشا ہے مرا رنگ حجاب

برف۔ دہشت ہے زندگی کی جوشش زوال میرا
کہسار کی جبیں پر ہے انفعال میرا
تعمیر ہے کسی کی گرتی ہوں آہ بن کر
دل وقت سنگ دل کا ہے پائمال میرا

(زور کا طوفان آتا ہے۔ چنار کے درختوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ جلتے ہوئے درخت پکارتے ہیں)

چنار کے درخت: ہوا اور پانی سے ہم جل رہے ہیں
یہ رحمت کے اضداد میں پل رہے ہیں
فرشتہ اجل کا ہمارا دروں ہے
یہ جنگل ہے یا موت کا ارغنوں ہے
ہماری صداؤں کی آتش نوائی
کیے جا رہی ہے لگائی بجھائی
محبت کی گرمی سے پامال ہیں ہم
خدا رکھے شاید جواں سال ہیں ہم

(فطرت کی اس ہم نوائی کا ساتھ ہمالہ نہیں دیتا۔ سب حیرت سے پوچھتے ہیں۔ ہمالہ جواب دیتا ہے)

ہمالہ : مری خاموشیوں پر میری فطرت کی نوازش ہے ۔۔۔ بلندی فطرت خاموش کی اک آزمائش ہے
تنہا اے ہمنوا مجھ سے اپنی ہو نہیں سکتی ۔۔۔ مری جاں اپنا گنج خامشی یوں کھو نہیں سکتی
مگر جو طائر بام فلک سیاح انجم ہے ۔۔۔ بپا بحر ازل میں فکر کا جس کے تلاطم ہے
صدا اس کی سنو روح تصور جھوم جائے گی ۔۔۔ نظر اک فطرت عالی کی نغمہ بن کے آئے گی

(اس وقت ہمالہ کی خاموش اور بلند چوٹیوں پر فضائے آسمانی میں یہ نغمہ گونجتا ہے)

اے[1] ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں ۔۔۔ چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں ۔۔۔ تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی ۔۔۔ کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی ۔۔۔ سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراق دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر، دل سمجھتا ہے تری آواز کو ۔۔۔ (بانگ درا)

تیسرا منظر

نغمۂ کائنات

(کرۂ ارض کی ایک پرسکون وادی۔ آبشار گرتا ہوا۔ آسمان پر ستارہ زہرہ جگمگا رہا ہے۔ اقبال کی روح اس میں کھڑی ہے۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان روح اور ہے۔ یہ دنیا میں کسی دن پیدا ہونے والے شاعر کی ہے۔ اقبال اسے زمین کی طرف رخصت کر رہے ہیں۔ نوجوان روح اقبال کو سلام کر کے آگے بڑھتی ہے اور سطح ارض پر اترا تی ہے۔ اسے آتا ۔ دیکھ کر روح ارضی یہ ترانہ گاتی ہے)

کھول[2] آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ ۔۔۔ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

---

[1] بانگ درا ۔۔۔ [2] بال جبریل صفحہ ،

اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ ایامِ جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکہ بیم و رجا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپیدا ترے بحرِ تخیل کے کنارے پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہ رسا دیکھ

(شاعر مستقبل کی روح جب گذرتی ہے تو اقبال فلک زہرہ سے مسکراتے ہیں۔ اتنے میں عالم ناسوت ان سے یوں مخاطب ہوتا ہے)

عالم ناسوت: مجھ پر کھلا وہ عکسِ جاں آئینہ حیات کا میں بھی تو ایک شعر ہوں محفلِ کائنات کا
میرے یہ باغ و راغ ہیں حسن ازل کی داستاں محفلِ ناز دست میں رنگ ہوں التفات کا

(روح اقبال عالم ناسوت سے کہتی ہے)

عالم آب و خاک و باد سرعیاں ہے تو کہ میں وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں
وہ شب و روز و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے اس کی سحر ہے تو کہ میں اس کی اذاں ہے تو کہ میں؟
کس کی نمود کے لیے تام و سحر ہیں گرمِ سیر شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں؟
تو کفِ خاک و بے بصر میں کفِ خاک و خود نگر کشتِ وجود کے لیے آبِ رواں ہے تو کہ میں؟

(اس کے اٹھتے ہی افلاک میں نغمے گونجنے لگتے ہیں۔ چند آوازیں اس طرح آ رہی ہیں)

ستارے: کسی کی شوخیٔ غم دل کی آہ بن کے رہی کسی کی روح ہماری نگاہ بن کے رہی
ہمارے آگے بھی پہنچا خیالِ حسن پرست شعاعِ منزلِ جاں خضرِ راہ بن کے رہی
چاند: لے رہا تھا میری بستی کا سکوں انگڑائیاں سوزِ خاموشی میں جلتی تھیں مری تنہائیاں
میرے غاروں میں اداسی تھی عدم آباد کی میرے کہساروں میں وحشت تھی دلِ برباد کی
کس نے روحِ آسماں کو اپنی منزل کر دیا کس نے مجھ کو سینۂ آفاق کا دل کر دیا

خورشید: میری نگاہ دل گداز آگ کی پرشگال تھی میری فضائے آتشیں ہیبتِ ذوالجلال تھی
خنجرِ برق آشنا میری تجلیوں میں تھا دشنۂ غیظ کبریا میری تسلیوں میں تھا

آتش دل بڑھا سی دی کس کی صدائے دردنے — سوزشِ عشق بخش دی، کون فلک نورد نے؟

فضائے آسمانی۔ کون کہتا ہے کہ طے کرتی ہے اک جست نگاہ — یہ طلسم برق و رنگ مہ و نور کی جانسوز راہ

رضواں۔ مری نگاہِ محبت کا آشنا ہے کوئی — مجھے خیال عبادت سے دیکھتا ہے کوئی

فردوس۔ یہاں نہ حوروں میں تشنگی تھی — نہ ان کی بے تاب تھیں نگاہیں

نہ کانپتی تھیں نظر سے ان کی — عروس فطرت کی بارگاہیں

یہ کون بولا مرے مکانوں — میں فکر و ذوقِ عمل نہیں ہے؟

یہ کون بولا کہ عشق انساں — کا دو جہاں میں بدل نہیں ہے؟

دو جہاں۔ شکر ہے ہم بھی آگئے ایک نگاہ ناز میں — پردۂ چشم ہٹ گیا محفل امتیاز میں

وقت۔ کس نے دیکھی تھی مرے رنگ ستیا کی بہار — کس نے سمجھا تھا مرے دورِ حکومت کا خمار؟

کس نے ظلمت سے نکالا تھا شبستانوں کو — کس نے انجم سے اجالا تھا گریبانوں کو؟

ساقی۔ محبت سے نو دل کو گرما گئی — وہ آواز تشنہ دہن آگئی

شراب کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا

بتا مجھ کو اسرار مرگ و حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

سمجھتے ہیں تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر — طلسم زمان و مکاں توڑ کر

تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں

ملائکہ۔ نغمۂ اللہ ہو کے پاسباں رہتے تھے ہم — بینوائے سوز دل تسبیح خواں رہتے تھے ہم

کس نے ہم کو آشنائے دردِ انساں کر دیا — کس نے ہم کو راز دار سوزِ ایماں کر دیا

جبریل: نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی — تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

ـلـہ بال جبریل کی اس نظم میں اشعار مختلف مقامات سے انتخاب جمع کئے گئے ہیں۔ انگریزی لفظ WHITEN کا ترجمہ

سروش : لعبت خاک ساختن می سزد خدائے را

لعبت خاک ساختن می سزد خدائے را

چوتھا منظر

مسجد قرطبہ

(روح اقبال مسجد قرطبہ میں ہے۔ ہسپانی آسمان کا چاند مسجد کے مینار سے کہتا ہے)

چاند۔ موجِ ہستی کوئی ساحل سے نکل کر دیکھے　　رنگِ عالم مری منزل سے نکل کر دیکھے

کس قدر اوج پہ ہے قیس محبت کا جنوں　　میری لیلےٰ مجھے محمل سے نکل کر دیکھے

لَآ اللہ کی جو صدا مسجد و محراب میں ہے　　ایک ایمان بھرے دل سے نکل کر دیکھے

عہد اسلام کے ماضی پہ تماشا بن کر　　آہ غم سینۂ بسمل سے نکل کر دیکھے

مینار۔ نظر اُٹھائی تو برباد تھا جہان عمل　　میں سر افروز ہوا یا گنہگار رہا

گیا نہ چرخ کے دل تک مری نگاہ کا تیر　　سمجھ رہا تھا کہ اس کے جگر کے پار ہوا

سنی تھی میں نے بڑی شان کی صدائے اذاں　　وہی نشہ مرے افکار کا خمار رہا

نظر نہ آئے گا شاید کبھی زمانے میں　　جو انقلاب کہ عالم پہ آشکار ہوا

مسجد قرطبہ۔ روح اسلام کبھی دہر سے ہوگی نہ فنا　　ایک نعرۂ صدر کی سن اب بھی صدا آتی ہے

(روحِ اقبال عالم محویت میں)

کافر ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق　　دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود

شوق مری لے میں ہے ذوق مری نے میں ہے　　نغمۂ اللہ ہو، میری رگ و پے میں ہے

تیرا جلال و جمال، مرد خدا کی دلیل　　وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل

لہ بال جبریل صہ ۱۳۶ ـ

تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور　　تیرا منار بلند، جلوہ گہِ جبرئیل

(پھر اُٹھ کر وادی الکبیر کی طرف جاتی ہے اور کہتی ہے)

آبِ روانِ کبیر، تیرے کنارے کوئی[1]　　دیکھ رہا ہے کسی اور زمانہ کا خواب

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں　　میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

ایسے میں زندگی، اقبال کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے وہ اس سے لانگ فیلو کی نظم "نغمۂ حیات" سنانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ زندگی مسکراتی ہے۔ اور چند خوب صورت لڑکوں کو سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ زندگی کہتی ہے۔ لانگ فیلو کی نظم انھیں یاد نہیں رہی۔ ایک اور نظم سنیئے)

لڑکوں کا سنگیت

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ　　جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے　　سرِّ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب　　اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

"عہد مسلم" سامنے آتا ہے اور کہتا ہے۔

اے کلیمِ روح و دل اور اے خلیلِ سوزِ جاں　　تیری چشمِ شوق پر روشن زمین و آسماں

تیری فطرت رازدانِ شوکتِ اہلِ حجاز　　تیری حکمت امتِ مرحوم کی آئینہ ساز

تیرے دل میں مرتعش نورِ محمد کا چراغ　　تیرے ہاتھوں میں منور علم و عرفاں کا ایاغ

قومِ مسلم نیم جاں ہے ہیچ و بے انجام ہے　　ان غریبوں کے لیے اب تیرا کیا پیغام ہے

(روحِ اقبال جواب دیتی ہے)

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا　　میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری

---

[1] بانگِ درا صہ ۴۹۲

میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ رمیدہ بو — میں حکایت غم آرزو تو حدیث ماتم دلبری

دم زندگی، رم زندگی، غم زندگی، سم زندگی — غم رم نہ کر سم غم نہ کھا کہ یہی ہے شان قلندری

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر — کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم — وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

(عالم اسلام کے مختلف گوشوں سے آہوں کی صدائیں آتی ہیں۔ اور پھر چند شہر کہتے ہیں)

مکہ۔ یاں گرمی طواف تو ہے سوز جاں نہیں — لب پر وہ سنج زمزمہ الاماں نہیں

مدینہ۔ گم سیاست میں پیام مصطفےٰ — ہے دماغوں میں مقام مصطفےٰ

درس اب دیتی نہیں ام الکتاب — انقلاب اے دور ہستی انقلاب

قسطنطنیہ۔ ماتم جور زمانہ میں سنا کرتا ہوں — پاکی و حسن عمل کی میں دعا کرتا ہوں

دست جمہوریت آزاد قیادت بیدار — اک نئی لذت ایماں میں جیا کرتا ہوں

بغداد۔ کاش کے سارے اہل دل کام لیں اعتماد سے — یاں کی زمین پاک ہے لذت اعتقاد سے

دمشق۔ اے وائے انقلاب سے اوندھی ہوئی ہوں میں — کن قدسیوں کے پاؤں کی روندی ہوئی ہوں میں

مصر۔ ہر چیز پہ چھایا ہے اب ذوق شہنشاہی — مذہب نے سکھائے تھے آداب خود آگاہی

ایران۔ عرب کی تہذیب سے ملا تھا عجم کی تعمیر کو سہارا — نہیں ہے اب ہر دو زباں کو یہ صلح و آشتی گوارا

شام۔ نغمۂ اغیار ہوں، نغمۂ اغیار ہوں — کتنی دل افگار ہوں۔ کتنی دل افگار ہوں

میری زمین پاک تھی میری جبین پاک تھی — آج اُس عہد کی دل سے طلبگار ہوں

ایک سے بڑھ کر ہے ایک میرے لیے دشنہ تیز — کفر کی آغوش میں قیدی غدار ہوں

فلسطین۔ جور یہود و جور نصاریٰ کے دکھاؤں — بہتا ہے خون مسلم نادان کیا بتاؤں

ہندوستان۔ الفاظ شوخ و شنگ کی تلوار چل گئی — قاسم کی روح میرے بدن سے نکل گئی

(روح اقبال ان آوازوں کو سن کر دعا کرتی ہے)

۱؎ بانگ درا ص ۲۸۴

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے　　جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

(نوجوان شاعر مستقبل کی روح پُراسرار طریقے سے مسجد کے ایک گوشے میں چھپی ہوئی یہ سُن رہی ہے اور دیکھ رہی ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتی ہے۔

شاعر مستقبل۔ روح فردا سے بنا ہے دل ناداں میرا　　وقت آتے ہوئے لائے گا گلستاں میرا
میری جاں روشنیٔ عشق پہ رقصاں ہوگی　　حُسن بن جائے گا جس روز بیاباں میرا
دل مرے رہبرِ عالی پہ فدا ہوتا ہے　　اس کے الہام میں پوشیدہ ہے ایماں میرا
روز بڑھتی ہی مری تشنگیٔ ذوق صدا　　ایسے نغموں سے ہوا درد کا درماں میرا

(شاعر مستقبل روانہ ہوتا ہے۔ روح ابلیس ایک زاہد کے لباس میں نمودار ہو کر راستہ میں حائل ہوتی اور کہتی ہے)

روحِ ابلیس۔ آ بتا دوں تجھ کو اپنے دل کی بات　　فکر کی آزادیوں میں ہے نجات
دوسروں کی آنکھ سے دیکھیں اگر　　ہیچ ہے یہ انتظامِ کائنات
غور سے خود پڑھ کلامِ اقبال کا　　رائیگاں ورنہ یہ صبح و شام ہے
کر خودی پیدا کہ مل جائے خدا　　تیرے شاعر کا یہی پیغام ہے

(شاعر مستقبل ایک عالمِ فکر اور اندیشہ میں پڑ جاتا ہے اور سر جھکائے ہوئے چلتا ہے روحِ ابلیس پرستارانِ اقبال شوق اقبال کا جائزہ لینے جاتی ہے۔ کئی جگہ آزمائش کے بعد خوشی خوشی واپس آتی ہے کہ اس کے وسوسوں کو ہنوز دھکا نہیں پہنچا۔ وہ جیسے تھے ویسے ہی ہیں وہ اطمینان کا سانس لے کر کہتی ہے)

روحِ ابلیس۔ شکر ہے علم نے کی میری تسلی ورنہ　　میں بھری بزم میں بے چین ہوا جاتا تھا
شورِ ہستی کا بھلا ہو کہ مٹایا اس کو　　نعرۂ حق دلِ یقین مجھ سے سُنا جاتا تھا
میں نے دکھلائی زمانہ کو وفاؤں کی بہار　　شاعرِ دل مری تعریف کیے جاتا تھا

چھٹا منظر

بارگاہِ فطرت

(ایک دن بارگاہ فطرت میں مظاہر حیات کی ایک مجلس گرم ہوتی ہے۔ ہوا، پھول، شبنم صبح، نور، روح، رقص، فوارہ، لالہ، صحرا، سمندر، موجِ شمع، پروانہ، جگنو، ابرِ کوہسار نسیم سحری، امید، وجد نگاہ۔ جلال و جمال، جدّت و تخلیق کے حسین پیکر سب جمع ہوتے ہیں۔ ہوا کی پری پاؤں میں شبنم کے گھنگرو باندھ کر رقص کرتی ہوئی آتی ہے۔ اور یوں نغمہ سرا ہوتی ہے)

ہوا کی پری۔ چھُنن چھنا چھن۔ چھنن چھنا چھن   چھنن چھُنا چھُن، چھُنن چھُنا چھن
سحر[1] مرا دل، نظر مری جاں   اثر مرا غم، خطر مری شاں

پانچواں منظر

وسوسۂ شیطانی

(روحِ ابلیس عالم تنہائی میں بے قرار نظر آ رہی ہے اور اپنے آپ سے کہتی ہے)

روحِ ابلیس۔ آہ تیرہ سو برس پہلے جو گونجی تھی صدا   کیا غضب ہے پھر وہی روحوں کو گرمانے لگی
گم کیا تھا جس کو میں نے خوابِ جلوۂ زیست میں   پھر وہی تعبیر میرے سامنے آنے لگی
کروٹوں میں زندگی کی میں نے ٹالا تھا جسے   بے قراری پھر وہی آفاق پر چھانے لگی
کیوں ہوا محرابِ جاں میں نور کا روشن چراغ   ظلمتِ قلب و نظر کیوں دل سے شرمانے لگی
یاالٰہی کیوں مٹا جاتا ہے مغرب کا فسوں   روحِ مشرق کس لیے پھر ہوش میں آنے لگی
کیوں ہوا پیدا دیارِ ہند میں اک بے قرار   کس لیے روحِ غلاماں جھوم کر گانے لگی

---

[1] یہ بحر موسیقی کی ایک خوب صورت لیکن مشکل تال "ترسولی یا "چاچر" پر قائم کی گئی ہے۔ بول ہیں دھا دھن دھا دھا تھ تا تن دھا دھا دھن اور تقطیع ہوگی۔ فَعَلُ فعلن۔ فعَلُ فعلن

نعرہ جذب قلندر سے لرز جاتا ہوں میں　　کیوں صدائے حق دلوں میں پھر جگہ پانے لگی

خیراب بھی اک تسلی ہے کہ شاید اہل ہوش　　سُن کے آواز جرس ہو لگے بیاباں میں خموش

جا کے بزم زیست میں یہ راز دیکھوں تو سہی　　عظمت شاعر کو دیوانوں سے پوچھوں تو سہی

(اتنے میں شاعر مستقبل کی روح ایک شفاف چشمہ کے کنارے کلام اقبالؔ کا مطالعہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہہ رہی ہے)

شاعر مستقبل۔ کیسے نظر آئے گا اس کا مقام بلند　　جو ہے ستاروں سے دور جو ہے تصور سے دور

عقل و خرد جس کے پر، ذوق جنوں جس کی روح　　بزم یقیں کے قریب چشم تحیر سے دور

چاہتا ہوں جاننا اس کے سخن کا پیام　　نغمۂ ذات و صفات جس کی صداؤں میں ہے

چاہتا ہوں منکشف مجھ پہ ہو اس دل کا راز　　تاب و تب کائنات جس کی اداؤں میں ہے

(اس وقت حضرت خضر سامنے آکر شاعر مستقبل کو ایک صحیح رہبر کا پتہ نشان بتاتے ہیں جو ہنگامہ ہستی سے دور ایک خانقاہ میں اقبالؔ پر خاموشی کے ساتھ فکر کر رہا ہے)

حضرت خضر۔ اے خوش خیال بزم محبت، نہ فکر کر　　جا اور اس کی محفل علم و ہنر کو ڈھونڈھ

ہر گام پر خیال رہے راہ راست کا　　ہو طالب پیام ازل یا لبشر کو ڈھونڈھ

میں پیام عالم راز ہوں ۔ میں صدائے بزم حیات ہوں

وفا کا فلک　　دعا کی زمیں　　خضر ہے کہیں　　سفر ہے کہیں

میں پیام عالم راز ہوں ۔ میں صدائے بزم حیات ہوں

وطن میں کبھی　　چمن میں کبھی　　چمک میں نہاں　　گہن میں کبھی

میں پیام عالم راز ہوں ۔ میں صدائے بزم حیات ہوں

فلک سے پرے　　زمیں پہ سفر　　ملک سے ملوں　　خدا پہ نظر

میں پیام عالم راز ہوں ۔ میں صدائے بزم حیات ہوں

چھُنن چھنا چھن ، چھُنن چھنا نن　　چھُنن چھنا چھن ، چھُنن چھنا نن

(ہنستے ہوئے پھول پری سے کہتے ہیں)

پھول ۔ شاید تو سمجھتی تھی وطن دور ہے میرا　　اے قاصدِ افلاک نہیں دور نہیں ہے

ہوتا ہے مگر محنتِ پرواز سے روشن　　یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے

(صبح اٹھلاتی ہوئی آتی ہے)

صبح ۔ مانندِ سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ　　آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے

ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش و لیکن　　ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

(اتنے میں آفتاب کی کرنیں نور برساتی ہوئی مسکراتی آتی ہیں)

ایک کرن ۔ مرے نزول میں جاں بخشیوں کی فیض و عطا　　مرے خرام میں ارواحِ آسماں کا جمال

میں چھن رہی ہوں کہ فطرت میں ہے نمود مری　　میں جل رہی ہوں کہ گردش میں آئے جامِ سفال

(اسے دیکھ کر شبنم پپی گاتی ہوئی اڑ جاتی ہے ۔ کرن کہتی ہے)

کرن ۔ دل آئینے کی طرح صاف ہے مغنی کا　　نگاہ صاف کو عالم میں کوئی باک نہیں

گلہ کرنا ہے موجِ نفس سے زہر آلود　　وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

(اتنے میں سمندر کی گونجتی ہوئی آواز آتی ہے)

سمندر ۔ میں[1] بھی ہوں　روحِ یزداں　مجھ میں ہے　زورِ طوفاں

تاروں کا　میں افسانہ　جلووں کا　میں دیوانہ

عالم میں　میری شوکت　ہستی میں　میری عظمت

آئینہ　نورِ جاں کا　گنجینہ　میں ایماں کا

شورش ہے　میرے دل میں　میں بھی ہوں　آب و گل میں

(موج دریا لہریں مارتی ہوئی آتی ہے اور کہتی ہے)

موج دریا ۔ میں[2] اچھلتی ہوں کبھی جذبۂ کامل سے　　جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے

---

[1] یہ بحر موسیقی کی ایک اور تال جھومرا پہ ہے بول ہیں ۔ دہن دہن نا ۔ دہا گے ترکٹ دہن نا تن نا ۔ دہا گے ترکٹ دہن نا تقطیع ہوگی ۔ فعولن ۔ مفعولاتن ۔ مفعولن مفعولاتن ۔

[2] بانگ درا ص۵۵

ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے
کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے

زحمت تشنگی دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعت بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

(شمع نور کا تاج پہنے ہوئے آتی ہے اور کہتی ہے)

شمع۔ پوچھتا ہے مجھ سے یہ ایک شاعر رنگیں نوا
کس کی ممنون کرم ہے میری فطرت کی ضیاء

از کجا ایں آتش عالم فروز اندوختی
کرمک بے مایہ را سوز کلیم آموختی؟

(جگنو چمک کر کہتا ہے)

جگنو۔ کس طرح میرا جلوہ کوئی دکھا رہا ہے
آتی ہیں سن صدائیں فطرت کی انجمن میں

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

(پروانہ آواز دیتا ہے)

پروانہ۔ پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو
کیوں آتش بے سوز پہ مغرور ہے جگنو!

(جگنو جواب دیتا ہے)

جگنو۔ اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں
دریوزہ گر آتش بیگانہ نہیں میں

(ایک آواز آتی ہے)

اے کرمک شب تار سراپائے تو نور است
پروانہ تو یک سلسلۂ غیب و حضور است
آئین ظہور است
مائیم کہ ماہند تو از خاک دمیدیم

لہ بانگ درا صہ ۸۳ ۔ ۲ہ پیام مشرق

دیدیم تپیدیم نہ دیدیم تپیدیم
جائے نہ رسیدیم

(نگاہ کی پری مسکراتی ہوئی آتی ہے اور گنگناتی ہے)

نگاہ کی پری۔ بہارِ و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی
شباب و مستی و ذوق و سرود و رعنائی
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر یہ فلک نیلگوں کی پہنائی
سفرِ عروس قمر کا عماریٔ شب میں
طلوع مہر و سکوت سپہر مینائی
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال زیبائی

(روح اقبال اس روح پرور بارگاہ میں لب جو ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی اپنا گیت گا رہی ہے۔ پہاڑوں سے آواز ٹکرا کے ساری فضا میں گونجتی ہے۔ پریاں۔ حسین پیکر اور ساری مجلس رقص کرتی اور خوشیوں کی بانسریاں بجاتی ہے۔

روح اقبال۔ میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں
گاہ میری نگاہ تیز چیر گئی دل وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں
تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

(آواز سروش پُر ہیبت صلابت سے گونجتی ہے۔ روح اقبال اسے سن کر)

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہ الا ہُو
نہ مے نہ شعر نہ ساقی نہ شورِ چنگ و رباب
سکوت کوہ و لب جوئے و لالۂ خودرو

ساتواں منظر

خانقاہ

(شاعر مستقبل کی روح حضرت خضرؑ کے بتاتے ہوئے راستہ پر چل رہی ہے اور خاموش

مفکر کی خانقاہ کی طرف جارہی ہے راستے میں اسے کالج، فوجی تربیت گاہیں۔ سیاسی دفاتر
دارالمباحث ملتے ہیں۔ یہ ان کی طرف سے منہ پھیر کے گذر جاتی ہے)
(شہر کی سرحد پر پُر فضا جنگل اور گنجان درختوں کی چھاؤں میں ایک چھوٹی سی خانقاہ ہے
اس کے کنگورے پر ایک پرندہ بیٹھا ہُوا روح شاعر کا استقبال کرتا ہے)

پرندہ ۔ اے گلستانِ عشق کے راہی خوش آمدی — اے پیکرِ حسین نگاہی خوش آمدی
گلشن میں آمد آمدِ فصلِ بہار ہے — عالم تمام رحمت پروردگار ہے
ہنگامۂ حیات سے خاموش ہے فضا — مستیٔ جاں سے میکدہ بردوش ہے فضا
آشفتگیٔ فکر و تماشا یہاں نہیں — اک نورِ منتظر ہے زمین آسماں نہیں
ہر موجۂ نسیم میں ہیں خوشگواریاں — ہر پردۂ نگاہ میں ہیں یادگاریاں
پرواز میں طیور کے طوفانِ زندگی — ہر برگِ گل کی چھاؤں گلستانِ زندگی
یاں غور مطمئن ہے یہاں فکر پُرسکوں — ہر جنبشِ خیال محبت کا ارغنوں
شہرت کی دھوپ سایہ مٹاتی نہیں کبھی — گرمیٔ غلط نگاہ کی چھاتی نہیں کبھی
خوش ہوں کہ تیری روح میں اک ارتعاش ہے — خوش ہوں کہ تجھ میں جرأتِ فکر و تلاش ہے
یاں آکے اپنے دل کی تمنا مٹائے گا — خاموشیٔ حیات سے کچھ فیض پائے گا

(شاعر کی روح پرندے کا یہ گیت سُن کر محو ہو جاتی ہے۔ پھر کہتی ہے)

شاعرِ مستقبل ۔ اے مطربِ خیال ابھی نغمہ سُنائے جا — اس منزلِ سکوں کا ابھی گیت گائے جا

(طائر پھر نغمہ سرا ہوتا ہے)

پرندہ ۔ منزلگہِ سکون کی تمنا خدا گواہ — تسکینِ آرزو کا تقاضا خدا گواہ
اک زندگی ہے دولتِ کون و مکان ہے — اک جنت خیال ہے ہفت آسمان ہے
اس سرزمینِ پاک کے نزدیک آکے دیکھ — یہ خاک بے نیازِ جبیں سے لگا کے دیکھ
یاں کھڑکیاں ہیں جلوۂ حسن و جمال کی — چھن چھن کے گر رہی ہیں شعاعیں خیال کی

(یہ گا کر پرندہ اڑ جاتا ہے۔ شاعر کچھ سوچ کر خانقاہ میں قدم رکھتا ہے۔ یہاں ایک درویش

(کتابوں کا انبار لگائے ہوئے کچھ لکھ رہا ہے روح شاعر اجازت مانگ کے یوں گویا ہوتی ہے)

شاعر مستقبل - اے رہنمائے فکر و نظر، خضر بے نیاز
جس کی نگاہ پاک پہ ظاہر دلوں کا راز

اک بے قرار زیست ہوں آشفتہ نگاہ
کرتا ہوں فکر شعر کا ہر سانس میں گناہ

اقبالؔ کے کلام سے مجھ کو نیاز ہے
اقبالؔ میری زیست، مرا فخر و ناز ہے

کرتا ہوں اس کے ساتھ تماشائے زندگی
پاتا ہوں اس میں اپنی تمنائے زندگی

لیکن بہت عمیق یہ بحرِ خیال ہے
مجھ سے بہت بلند یہ اوجِ کمال ہے

آتا نہیں ہے فہم میں اس زور کا کلام
سمجھایئے مجھے مرے اقبالؔ کا پیام

(درویش کچھ تبسم کر کے اور تھوڑی سی فکر کے ساتھ عینک کتاب پر رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اقبالؔ کے پیام سے پہلے انھیں ایک نصیحت کرنی ہے)

مفکر درویش سن پہلے کہ آنا ہے تجھے بزم جہاں میں
کر غور کہ تاثیر ہے کچھ تیری زباں میں

نزدیک ہے آزاد خیالی کا زمانہ
بن جائے گی یہ بزم جہاں غم کا فسانہ

تو ہو نہ کبھی بادہ کشِ محفل اغیار
برباد نہ کر دہر میں آزادیٔ افکار

آفت ہے دل و جاں کے لیے دہر کا جادو
اک آگ ہے ارماں کے لیے دہر کا جادو

عظمت کے تلاطم میں بہے جاتا ہے انساں
ہر بات پرائی ہی کہے جاتا ہے انساں

پھیلا ہے ترے سامنے مستقبل خاموش
دا ترے دل و جاں کے لیے وقت کی آغوش

ہو گا ترے ہاتھوں میں زمانے کا تخیل
آئے گا ترے سامنے قوموں کا تجاہل

عظمت کی مے ناب سے بھر ساغر الہام
لے شاعر عالی سے دل پاک کا انعام

اس میں مگر آزادیٔ فطرت نہ بہا دے
کونین کو اپنا کوئی پیغام سنا دے

شاعر مستقبل - اپنی کمزوریٔ تعظیم کو پہچان گیا
واہ کیا بات بتائی ہے کہ دل مان گیا

(مفکر درویش پھر کہتے ہیں)

اے نوجوانِ شوق ترے درد کے نثار
اقبالؔ کے پیام کا اب کر نہ انتظار

کھول آنکھ اور دیکھ نگاہ نیاز سے
آتے ہیں کون کون حریم مجاز سے؟

(شاعر مستقبل دیکھتا ہے کہ چار خوب صورت پیکر جن کے چہروں پر آسمانی تجلیاں برس رہی ہیں زرنگار تاج پہنے، ہوئے داہنے ہاتھوں میں ستاروں کی شمعیں لئے اور اپنے بائیں ہاتھ ایک دوسرے سے ملائے ہوئے رقص کناں آرہے ہیں۔ ان پیکروں کے تاجوں پر سنہری حروف میں "عشق" "یقین" "خودی" اور "عمل" لکھا ہوا ہے جلوس یہ ترانہ گاتے ہوئے گذرتا ہے)

عشق۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
خودی۔ قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
یقین اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
عمل ۔ تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
سب مل کر ۔ اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

(درویش کہتے ہیں)

مفکر درویش ۔ اس گوشۂ تاریک میں ہم اہل نظر ہیں — اک مشعل رہ، روشنی راہ گذر ہیں
سمجھاتے نہیں آنکھوں دکھاتے ہیں مسائل — رہتے نہیں الفاظ یہاں دید کے حائل
اقبال کے پیغام کے یہ چار عناصر — احساس پہ تیرے ہوئے اس شان سے ظاہر
اللہ کرے دل جو ترا ان کا پرستار — اللہ کرے ان کا ہو نزدیک سے دیدار

(صدائے الہام آتی ہے)

عشق و خودی یقین و عمل چار عکس ہیں — یہ ایک آئینہ ہیں تری جلوہ گاہ میں
ان چار موتیوں کو پرو ایک ہی جگہ — اک رشتۂ خیال ہو تیری نگاہ میں
شاعر مستقبل ۔ قربان اس نگاہ کے جس نے بہ یک نگاہ — اقبال کے پیام کو آنکھوں دکھا دیا
کوندائیں بجلیاں مرے وہم و گمان پر — گویا مرے خیال کو عارف بنا دیا

(پھر یوں دعا کرتا ہے)

ؔ بال جبریل ص۲؎

رواقِ فلک پر کھلی ہیں نگاہیں — نظر آ رہی ہیں تری بارگاہیں
الٰہی مجھے ذوقِ فکر و عمل دے — الٰہی مجھے قوت بال و پر دے
سرافراز ہے انقلاب زمانہ — تلاطم میں ہے زندگی کا فسانہ
ملے مجھ کو اس بزم میں راست راہی — تجلی سے پیدا ہو روشن نگاہی
میں جذبات عالم کو رستہ دکھاؤں — نظر کی طرح ساری دنیا پہ چھاؤں
مرے دل پہ روشن ہو پیغام شاعر — دل و جاں رہیں آسماں کے مسخر
ہو جوشِ محبت مری رہنمائی — مرے دل پہ چھا جائے رنگِ خدائی

آٹھواں منظر

وادیٔ ظلمت

(آدھی رات۔ شاعر مستقبل کی روح ایک جنگل میں بیٹھی ہوئی تصور کے گلستاں کھلا رہی ہے
آدھی رات اس سے کہتی ہے)

آدھی رات۔ اک مشعل جاں ہے مری فطرت کی سیاہی — اے نجم درخشاں تری ثابت ہے گواہی
اٹھ اے نگہِ شوخ کے خاموش پرستار — لٹتی ہے یہاں دولت آشفتہ نگاہی
ہے دست درازی کے لیے دامن عالم — ہے سایہ فگن فرق پہ منشائے الٰہی
میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک — دیرینہ ہے تیرا مرض کور نگاہی

روح شاعر۔ مرے فروغ تخیل کا فیض ہے عالم — یہ کائنات مری چشم دلنواز میں ہے
تو دیکھتی نہیں تخلیق جاوداں کا حرم — مرے مدینہ میں ہے اور مرے حجاز میں ہے
مرے رسول ہیں یہ دلبران حسن و جمال — پیام عشق مری وحی جاں نواز میں ہے
کھلے ہیں میرے لیے جبرئیل کے بازو — ہجوم حور و ملک میری بزم ناز میں ہے
اگر میں چاہوں تو پیدا کروں جہاں اپنا — دکھاؤں چشم تماشا کو آسماں اپنا

آدھی رات۔ اگر ہے دعویٔ تخلیق تجھ کو اے شاعر — تو اپنی کوئی زمیں آسماں بنا کے دکھا

مری نگاہ پہ چھاتے نہیں فقط دعوے — ہر ایک منظر تخلیق جگمگا کے دکھ

روح شاعر۔ خشک تھی یہ سرزمیں فیضان قدرت سے مگر — دیکھ اس وادی میں اک بہتا ہوا چشمہ مرا

(ایک شفاف چشمہ بہتا ہوا نظر آتا ہے)

چشمہ ۔ ہر حسن اضافی ہے ہر حسن تماشا ہے — بہتا ہوا دنیا میں دریائے تمنا ہے

جاری رہے عالم میں اک انجمن آرائی — تخلیق مسلسل ہی فطرت کا تقاضا ہے

روح شاعر۔ تیرے پہلو سے نکالا میں نے اک چھوٹا سا باغ — دیکھ اس پہ ناچتے ہیں کتنے پھولوں کے ایاغ

(پھولوں کا ایک شاداب باغ چشمے کے کنارے اُگتا ہے اور لہلہاتا ہے)

باغ ۔ لے گئی باغ میں طوفان محبت کو بہار — ڈالی ڈالی مرے محبوب کا افسانہ ہے

ہر طرف بادۂ ہستی کے چھلکتے ہیں جام — پھر بھی اک چیز سے خالی مرا پیمانہ ہے

روح شاعر۔ اچھا تو اپنی چھاؤں میں اک طائر حزیں — اپنی صدائے درد سے ہے نغمہ بار دیکھ

(شاخ پر ایک پپیہا "پی کہاں۔ پی کہاں"۔ کی آواز دیتا ہے)

روح شاعر۔ محو ہو کر گاتی ہے نہ

تو کیستی[1] و من کیم، از صحبت ما چیست — بر شاخ گل ایں طائرک نغمہ سرا چیست

مقصود نوا چیست ؟

مطلوب صبا چیست ؟

ایں کہنہ سرا چیست ؟

شاید کہ چمن رزم حیات ہمہ جوئی است — بزمے است کہ شیرازہ او ذوق جدائی است

دم؟ گرم نوائی است

جاں؟ چہرہ کشائی است

ایں راز خدائی است

---

[1] پیام مشرق ص ۱۳۵

پپیہا کی آواز۔ برخیز و دل از صحبت دیرینہ بپرداز   بالالہ خورشید جہاں تاب نظر باز

بااہل نظر ساز

چوں من بہ فلک تاز

داری سر پرواز؟

(یہ گاکر پپیہا اڑجاتا ہے۔ روح شاعر پپیہے کو آسمان کی طرف اڑتا ہوا دیکھتی ہے۔ اس کی نظر جھلملاتے ہوئے تاروں پر پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پپیہا ستارہ سرطان کے سامنے گذر گیا۔ روح شاعر کی نظر ستارۂ سرطان پر جم جاتی ہے۔ اور بے تاب ہو کر جواب دیتی ہے)

خالی "سر پرواز" نہیں قوت جاں بھی   یہ وسعت افلاک بھی یہ کون و مکاں بھی
اڑتے ہوئے میں شعلہ انجم کو ہوا دوں   بجھتے ہوئے سیاروں کی آنکھوں کو جگا دوں
پیچھے مرے آتا رہے یہ گنبد دوّار   آگے مرے چلتا رہے ہر ثابت و سیار
ہر عظمت گرداں کے تگ و تاز سے نکلوں   طوفان سے نکلوں کبھی آواز سے نکلوں
ہو جائیں تجلی کی بہت تیز ہوائیں   دیکھیں جو مجھے اہل فلک رقص میں آئیں

(شاعر کی روح آسمان کی طرف اڑتی ہے۔ ستارہ سرطان خود بھی قریب آتا ہے۔ اس کے اطراف چکر لگانے والا محور نور صاف نظر آنے لگتا ہے۔ سرطان اس طرح دعوت دیتا ہے)

آ۔ اے نظر افروز تجلی پہ کھڑا ہو   اس مرکز انوار کا آئینہ نما ہو
پی آنکھ سے یہ بادۂ پیمانۂ افلاک   چل پاؤں سے بالائے طربخانۂ افلاک
انجم کی نگاہوں سے اڑا ذوق تماشا   دیکھ آنکھ سے آئینۂ ایوان تجلی
کس شان سے ہوتی ہے یہاں گردش انجم   سن غور سے سیاروں کے نغموں کا تلاطم
آنکھوں کے مقابل ہے یہاں چرخ کی رفعت   نزدیک نگاہوں کے ہے کونین کی وسعت
جو دور تھا نزدیک ہے۔ جو سرد تھا روشن   دامن سے لگا ہے ترے افلاک کا دامن

(روح شاعر سرطان کے محور نور پر کھڑی ہوئی رقص کرتی ہے اور وجد میں آکر گاتی ہے)

روح شاعر۔ میں تعمیر و تخلیق کی نا خدا ہوں   بڑی خود نما ہوں، بڑی خود نما ہوں

بہت حیرت افزا ہیں گو یہ نظارے — بہت دلربا ہیں یہ سب ماہ پارے
مگر مجھ کو ہوتی نہیں اس سے تسکیں — سلامت رہے روح کا فخر و تمکیں
اضافہ کروں خود نمائی میں شاید — ابھی کچھ کمی ہے خدائی میں شاید

(یہ گاتے ہی سرطان کا محور تیز تیز گردش کرنے لگتا ہے اور اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ روح شاعر اس پر سے تنکے کی طرح اڑ جاتی ہے اور ایک وسعت بے کنار کی طرف بہتی چلی جاتی ہے۔ اس کے پیچھے سیاروں کے شعلے، گردش کی ہوائیں، رقص کی آوازیں شور کرتی ہیں، اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ روح شاعر کاروان در کاروان ستاروں کو تیزی سے گذرتا ہوا دیکھتی ہے۔ انجم کا یہ سرود سنائی دیتا ہے)

جلوہ گہ شہود را — بت کدۂ نمود را
رزم نبود و بود را — کشمکش وجود را
عالم دیر و زود را — می نگریم و می رویم
خواجہ ز سروری گذشت — بندہ ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت — دور سکندری گذشت
شیوہ بتگری گذشت — می نگریم و می رویم

(روح شاعر اب ایک ایسی ظلمت بے جہت میں آجاتی ہے جہاں اسے خود اپنے وجود کا احساس نہیں رہتا۔ اس ظلمت میں وہ زور کے ساتھ ایک سرخ رنگ کے دریا میں ڈال دی جاتی ہے جس کی موجیں قیامت خیز جزر و مد کے ساتھ اٹھ رہی ہیں۔ سوائے دریا کی سرخ موجوں اور ان کی آتشیں دنداں نمائی کے کچھ نظر نہیں آتا دریائے آتشیں کہتا ہے)

دریائے آتشیں

آ مری آغوش میں تخلیق کے اے ناخدا — تجھ پہ شاید ہنس رہی ہے ظلمت دنداں نما
ناز تھا اے بے خبر اپنے تصور پر تجھے — صبر کرنا ہے یہاں اپنے تحیر پر تجھے
التہاب شعلۂ تمکین قلب و جاں ہوں میں — امتحان کفر ہوں آئینۂ ایماں ہوں میں
میری موجوں میں اجل سے بھی زیادہ انتقام — میرے پانی میں جہنم سے بھی زیادہ احتشام
کم نظر کی رہنما ہے شعلہ آشامی مری — بے بصر کا راستہ ہے آتش افشانی مری

(روح شاعر دریائے آتشیں میں غوطے کھاتی ہے۔ ظلمت سے ایک آواز آتی ہے)

چو موج می تپد آدم بہ جستجوئے وجود — ہنوز تا بہ کمر در میانہ عدم است

روح شاعر۔ نے فروغ چشم و دل ہے نے چراغ قلب و جاں — الاماں اے ظلمت دریائے آتش الاماں

جور اتنا کس لیے اولاد آدم ہوں نا میں — شور اتنا کس لیے افسانۂ غم ہوں نا میں؟

ڈوبتی جاتی ہے میری کشتیٔ عقل و خرد — المدد اے شاعر حسن خدائی المدد

(روح شاعر کے سامنے ایک مہیب شکل و صورت کی مچھلی جس کا چہرہ دیو نما ہے ظلمت سے دو سرخ آنکھیں چمکاتی ہوئی ابھرتی ہے اور اسے پشت پر بٹھا کر کھینچ لے جاتی ہے۔ دوسری آواز آتی ہے)

بے زور سیل کشتیٔ آدم نمی رود — ہر دل ہزار عربدہ دارد بہ ناخدائے

از من حکایت سفر زندگی مپرس — در ساختم بہ درد و گذشتم غزل سرائے

(روح شاعر لپکا تی ہے)

اے ظلمت حیات مرے دل پہ رحم کر — اک وادی فنا میں مجھے اس طرح نہ کھینچ

تیسری آواز۔ پیش نگر کہ زندگی راہ بہ عالمے برد — از سر آنچہ بودہ رفت در گذر انتہا طلب

روح شاعر۔ فنا کی طرف مجھ کو لے جا رہی ہے — مری انتہا مجھ کو دکھلا رہی ہے

چوتھی آواز۔ بہ آں تاب و تابے کہ فطرت بہ بخشد — در خشم چو برقے بہ ابر سیاہے

(روح شاعر تڑپ کر مچھلی کی پشت پر سے کود جاتی ہے۔ کودتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ دریا کا پانی تھم گیا اور شاعر کو تھوڑی دیر کے لیے سکون کی ایک چٹان سی مل گئی۔ اس وقت روح اقبال کی یہ صدا آنے لگی)

انجم بہ گریباں ریخت ایں دیدۂ تر ما را — بیروں ز سپہر انداخت ایں ذوق نظر ما را

شام و سحر عالم از گردش ما خیزد — دانی کہ نمی سازد ایں شام و سحر ما را

شایان جنون ما پہنائے دو گیتی نیست — ایں راہ گذر ما را، آں راہ گذر ما را

(تھوڑی دیر بعد موجوں کی رفتار دھیمی دھیمی شروع ہوتی ہے۔ روح شاعر ان سے نکل نہیں سکتی۔ تھوڑی دور جا کر موجیں منجمد ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ روح شاعر بھی مدہوش ہو جاتی ہے۔ عالم سکوت یوں گویا ہوتا ہے)

عالم سکوت۔ یہ سکوتِ منجمد ہے یا اجل کا دام ہے ناشناسائے خدائی کا یہی انعام ہے

اے خیالِ مضطرب تیری تگ و دو کیا ہوئی اے نگاہِ بے محابا۔ تیری وہ رو کیا ہوئی؟

کیا ہوا وہ زندگی کا ذوق و شوقِ بے حجاب کیا ہوئی وہ گرم رو پیہم صدائے انقلاب؟

کیا ہوئی غافل وہ شوخی تیری چشمِ ناز کی کیا ہوئی ناداں وہ لرزش گرمیِ آواز کی؟

تیرے سینے میں جو برپا تھا وہ طوفاں کیا ہوا کوہ و صحرا کیا ہوئے صحنِ گلستاں کیا ہوا؟

تھم گئی آشفتگی، عقل و عرفاں کس لیے ہو گیا بے حس و حرکت قلبِ لرزاں کس لیے؟

(روحِ شاعر منجمد دریا میں بے حس پڑی ہوئی ہے۔ مدتوں پڑی رہنے کے بعد اس کے کانوں میں ایک آواز آنے لگتی ہے۔ یہ ایک قوی ہیکل کشتی بان کی آواز ہے جو ایک عجیب و غریب کشتی میں بیٹھا ہوا ہے)

اے[1] غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز کاشانۂ ما رفت بہ تاراج خزاں خیز

از نالۂ مرغِ چمن از بانگِ اذاں خیز از گرمیِ ہنگامۂ آتش نفساں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی صہبائے یقیں درکش و از دیرِ گماں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز

(کشتی باں روحِ شاعر کو کشتی میں بٹھا کر لے چلتا ہے اور گاتا ہے)

سفینہ دو جہاں کا ہے، یہ دریا لامکاں کا ہے یہ موجیں زندگی کی ہیں، یہ طوفاں آسماں کا ہے

ملے گر ناخدا کوئی تو پھر آساں ہے رستہ چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

نظر ہے بادباں اپنی، تصور ہے ہوا اپنی ہے آغوشِ خدائی میں بقا اپنی فنا اپنی

ملے گر ناخدا کوئی تو پھر آساں ہے رستہ چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

---

[1] زبورِ عجم ص ۱۱۰

دلِ دردآشنا ساتھی تو ایمائے ازل رہبر　　ہر اک موجِ زنداں کے ہاتھ میں عرفاں کا ساغر
ملے گر ناخدا کوئی تو پھر آساں ہے رستہ　　چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ
یہاں ہے صبر پیمائی، یہاں ہے حوصلہ کاہی　　مگر اس امتحاں سے ڈر نہ اے طوفان کے راہی
ملے گر ناخدا کوئی تو پھر آساں ہے رستہ　　چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

(روحِ شاعر کو ہوش آتا ہے لیکن پوری طرح نہیں۔ اس کے کانوں میں یہ شیریں نغمہ گونجتا ہے)

بینی[۱] جہاں را، خود را نہ بینی　　تا چند ناداں غافل نشینی
نورِ قدیمی شب را برافروز　　دستِ کلیمے در آستینی
بیروں قدم نہ از دورِ آفاق　　تو پیش ازینی تو بیش ازینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید　　مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نگیرند　　آدم بمیرد از بے یقینی

روحِ شاعر جاگ اٹھتی اور اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ یکایک ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بہت بڑا پرندہ جس کے پروں کی ہوا سے وادیٔ ظلمت کے کنکر پتھر اڑ جاتے ہیں۔ اسے اپنے پنجوں میں اٹھائے ہوئے پرواز کرتا ہے یہاں بھی ظلمت کامل ہے۔ روحِ شاعر اپنے آپ کو معلق محسوس کرکے کانپنے لگتی ہے۔ کوہ پیکر پرندہ کہتا ہے)

کوہ پیکر پرندہ۔ ظلمت کی روح ہستیٔ فانی پہ چھا گئی　　ٹھنڈی ہوا چراغِ محبت بجھا گئی
بے باکیٔ خیال قیامت اٹھا گئی　　احساسِ نور و ظلمتِ ہستی مٹا گئی

اڑتا ہے کوئی راہگزر جانتا نہیں
رہبر ہے ساتھ اور اسے پہچانتا نہیں

میرے پروں میں موت کا ہے زلزلہ نہاں　　میری ہوا سے بجھنے لگی شمعِ لامکاں
میری نظر میں جذب ہوا رنگِ آسماں　　میری صدا میں ڈوب گیا شورِ الاماں

لہ زبور عجم ص۱۴۸

بے جہت ظلمتوں میں اڑا جا رہا ہوں میں
کہسار میں عدم کے چلا جا رہا ہوں میں

(کسی گوشے سے آواز آتی ہے)

آتش از نالۂ مرغان حرم گیر و بسوز
آشیانے کہ نہادی بہ نہال دگراں

در جہاں بال و پر خویش کشودن آموز
کہ پریدن نہ تواں با پر و بال دگراں

(یہ آواز سنتے ہی روح شاعر تڑپتی ہے اور پرندے کے چنگل سے چھوٹ جاتی ہے اور بلندی کا ایک صبر آزما خلا طے کرتی ہوئی کئی گھنٹوں کے بعد ایک جگہ اُتر آتی ہے۔ وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی ہے اور افتاں و خیزاں چلتی ہوئی ہر چیز کو چھونے لگتی ہے۔ اس وقت آواز آتی ہے)

از خود اندیش و دریں بادیہ ترساں مگذر
کہ تو ہستی دو جود و جہاں چیزے نیست

(روح شاعر تیزی کے ساتھ چلنے لگتی ہے۔ بہت دور سرخ روشنی کی ایک ہلکی سی دھار اس طرح دکھائی دیتی ہے کہ اس کی وجہ سے خود فراموشی دور ہوتی اور احساس جاگنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح شاعر اوپر چڑھ رہی ہے۔ پہاڑ صدا دیتا ہے)

پہاڑ۔ اندیشہ کر کسی کے مقام حجاب کا
پھر جائزہ لے اپنے خیال خراب کا

جلوہ فروش کون ہے قصرِ خیال میں
کس کا فروغ ہے نگہہ پائمال میں؟

ذوقِ انا کی منزل فکر و عمل ہے کیا
بیکار دل کی بزم میں دستِ اجل ہے کیا؟

مدہوشی نگاہ میں کس کا جمال ہے؟
ارمان کے حصار میں کس کا خیال ہے؟

کس کی صدا سے تیز ہیں اعمال کے قدم
کھلتے ہیں کس کے سامنے جذبات کے علم؟

منصف ہے کوئی درد کے محشر بپا تو ہیں
چلتی ہے روح؟ عقل و خرد رہنما تو ہیں؟

(یہ سن کر روح شاعر پر ایک لرزہ طاری ہوتا ہے لیکن وہ سنبھل کر پہاڑ سے کہتی ہے)

روح شاعر۔ طے کرے گی ظلمتوں میں بھی انہیں میری حیات
سامنے تو چاہے جتنی سیڑھیاں پیدا کرے

لہ پیام مشرق ص ۲۰۹

یاد آتا ہے مجھے خضرِ محبت کا پیام — سینۂ مضطر میں جو برقِ رواں پیدا کرے
ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر — رات کے تاروں میں اپنا ہمراز داں پیدا کرے

(روح شاعر پہاڑ پر چڑھ جاتی ہے۔ اسے ایک غار سے آواز آتی ہے)

ہست[1] ایں میکدہ دعوتِ عام است اینجا — قسمت بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا
حرفِ آں راز کہ بیگانۂ صوت است ہنوز — از لبِ جام چکیدہ است و کلام است اینجا
ما کہ اندر طلبِ از خانہ بروں تاختہ ایم — علمِ جاں را بدمیدیم و عمل ساختہ ایم

(روح شاعر یہ آواز سُن کر سوچنے لگتی ہے اور کہتی ہے)

روحِ شاعر ہر ذرۂ حیات ہے اک روحِ ارتقاء — اس خود رو ازل کا کوئی رہنما بھی ہے
حیرت کا آئینہ ہے بیابانِ کائنات — ظلمت کی وادیوں میں کوئی راستہ بھی ہے
موت و حیات کھیل میں طوفانِ وقت کے — یاں ابتدا ہے اور کوئی انتہا بھی ہے
امید پر قیام وجود و عدم ہے کیا — سامانِ زندگی میں علاج قضا بھی ہے
اک پردۂ نظر میں ازل اور ابد کے راز — کیا عالمِ شہود کوئی دیکھتا بھی ہے
فردِ بشر نے پائی ہے تہذیبِ زندگی — دنیا میں امتیازِ ثواب و خطا بھی ہے
بیگانگی کی آگ میں جھونکے ہوئے غریب — میں پوچھتا ہوں دہر میں اپنا خدا بھی ہے

(روح شاعر پہاڑ کی چوٹی کے قریب ہے۔ جو آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ دور سے پیغام آتا ہے)

از خلش کرشمۂ کار نمی شود تمام — عقل و دل و نگاہ را جلوہ جدا جدا طلب

(اب شاعر کو اوپر سے کچھ اُجالا قریب آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت اسے ایک نہایت تنگ سرنگ سے گذرنا پڑتا ہے۔ جہاں ہاتھ پھیلانے کی جگہ بھی نہیں ملتی اور نہ سر اٹھا کر چلنے کی۔ اسے سر جھکائے ہوئے پتھروں سے

---

[1] پیامِ مشرق ص ۱۴۱

ٹکراتے ہوئے گزرنا پڑتا ہے۔ اسے سرنگ سے آخری گوشے پر پھر روشنی دکھائی دیتی ہے۔ جو بتدریج بڑھتی جارہی ہے۔ روح شاعر تھوڑا سے دروازے پر پہنچتی ہے، سامنے سے دو حسین پیکر روح شاعر کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتے اور گذرتے ہیں۔ ان کے تاجوں پر "عمل" اور "خودی" لکھا ہوا ہے۔ دونوں گاتے ہیں)

پیکر عمل۔ چو خورشید سحر پیدا نگاہے می تواں کردن ۔۔۔ ہمیں خاک سیہ را جلوہ گاہے می تواں کردن

نہ ایں عالم حجاب او را نہ آں عالم حجاب اُو را ۔۔۔ اگر تاب نظر داری نگاہے می تواں کردن

پیکر خودی۔ گوشم چیست! پیام است شنیدی نہ شنیدی ۔۔۔ در خاک تو یک جلوہ عام است ندیدی

دیدن دگر آموز، شنیدن دگر آموز

واسوختہ یک شرر از داغ جگر گیر ۔۔۔ یک چند بہ خود پیچ و نیستاں ہمہ در گیر

چوں شعلہ بہ خاشاک و دیدن دگر آموز

(روح شاعر ظلمت سے نکل کر ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ ان کی روشنی میں اس کے دل پر یقین کا کچھ القا ہونے لگتا ہے۔

نواں منظر

طوفان تجلی

(عمل اور خودی کے پیکر تھوڑی دور چل کے شفق کے ایک جھرمٹ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ا... شاعر ذروں سے زیادہ لطیف نور کے دھوئیں میں اپنے آپ کو محصور دیکھتی ہے۔ آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس وقت سامنے سے ایک عجیب قسم کا دیو ہیکل جانور نمودار ہوتا ہے جس کا آدھا جسم گوشت کا اور آدھا سخت دھات کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے روشنی کی ایسی تیز دھاریں دوڑتی ہیں کہ شبنمی نور میں ان کی چمک صاف نظر آتی ہے۔ وہ اژدہے کی طرح چار پاؤں سے رینگتا ہے۔ جب وہ سامنے آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوہ ہمالہ زرسا منے آیا۔ اس کی چال میں مایوسی ہے اور وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے۔ روح شاعر کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور انسانی لب و لہجہ میں کہتا ہے)

لہ زبور عجم صفحہ ۱۵۱ ۔ لہ زبور عجم

جانور۔ خاکدانِ آب و گل میں عقل کا زنداں ہوں میں
عظمت و گم گشتگی کا آہنی ساماں ہوں میں

پیکرِ سنگیں میں میرے جذب و نور و نار ہے
میری چشمِ دوربیں اک روزنِ دیوار ہے

سرِ حدِ افلاک کا عزمِ سفر تھا رہ گیا
اتنا درنی ہو کے ہلکی جنبشوں میں رہ گیا

تھا حریفِ روح و دل اور دشمنِ جوشِ جنوں
کردیا اسرار نے اس بزم میں خوار و زبوں

نور کے بادل میں کوئی رہنما ملتا نہیں
جھانکتا ہوں دیکھتا ہوں راستہ ملتا نہیں

سانس رک جاتی ہے جب اپنا بڑھاتا ہوں قدم
منہ جھلس دیتی ہے میرا گرمیٔ لوح و قلم

آہ اتنی منزلیں طے کرکے بھی ناکام ہوں
آہ اپنی روشنی کی ظلمتِ انجام ہوں

(یہ کہہ کر عقل کا دیو پیکر رینگتا ہوا گزر جاتا ہے ایک ایوان کے ریشمی پردوں سے چند ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے کوئی زور سے ذکر و شغل کر رہا ہو۔ یہ روحِ اقبال کا ذکر و شغل ہے)

پہلی آواز۔ عشق[1] ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

دوسری آواز[2]۔ میری متاعِ حیات، علم و ہنر کا سرور
میری متاعِ حیات ایک دلِ ناصبور

معجزۂ اہلِ فکر فلسفۂ پیچ پیچ
معجزۂ اہلِ ذکر موسیٰ و فرعون و طور

ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا
تو ہے ابھی ہوش میں میرے جنوں کا قصور

فیضِ نظر کے لیے ضبطِ سخن چاہیے
حرفِ پریشاں نہ کہہ اہلِ نظر کے حضور

تیسری آواز۔ یہ ہیں سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام
وہ جس کی شان میں آیا ہے عَلَّمَ الاَسْماء

مقامِ ذکر کمالاتِ رومی و عطار
مقامِ فکر مقالاتِ بوعلی سینا

مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکاں
مقامِ ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

۱؎ ضربِ کلیم ص ۶۷ ۲؎ ضربِ کلیم ص ۴۸

(روحِ شاعر میں ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک جست میں شبنمی پردوں سے گذر جاتی ہے۔ تھوڑی دور تیز روشنیوں میں چلنے کے بعد اس کے سامنے ایک نور کی چادر سی بہتی ہوئی آتی ہے۔ چادر پر اتنی چمک ہے کہ راستہ نظر نہیں آتا۔ روحِ شاعر دیکھتی ہے کہ پانی میں سے ایک حور سرخ رنگ کی نکلتی ہے۔ اس کے زخمی سینے میں ایک زمردیں تیر چبھا ہوا ہے اور اس سے دل کی شکل کا ایک ایک خونیں قطرہ گرتا ہے جس سے نور کی چادر سرخ ہو جاتی ہے۔ یہ حور درد بھری آواز میں یہ ترانہ گاتی ہے)

حورِ دل۔ ہے جلوہ گاہِ عرش کی نگاہ میں تجلیاں — حریمِ قدسِ عشق کی خیال میں تسلیاں
خرد کی برقِ تیز رو ہے زلفِ تابدار میں — جنوں کے لالۂ حزیں، ہیں قلبِ داغدار میں
نظر اٹھا کے جب چلوں تو مستیاں نثار ہوں — جھکا کے آنکھ جب چلوں تجلیاں نثار ہوں
قدم قدم پہ جام ہے لنڈھائے شوخیاں مری — شبابِ زندگی میں ہوں ہزار گرمیاں مری
ازل کی تابشوں سے ہے رخِ حسین تابدار — جبینِ شوق سے گرا، تجلیوں کا آبشار
قیامت آفریں یہ دل، ہجومِ آرزو سے ہے — جگر میں موجِ آتشیں مذاقِ جستجو سے ہے
مری ہتھیلیوں میں ہیں فلک کے ماہ و آفتاب — مرے خرامِ ناز میں، ہے کہکشاں کا التہاب
مری فضائے زیست میں جنوں کا اختتام ہے — مری حیات خوں چکاں، وصال ناتمام ہے

(اس کے پیچھے ایک روح اپنے سینے پہ ہاتھ رکھے ہوئے اور قدم قدم پہ اپنے دم آگے چلنے والی کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہے)

قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل — التجائے اَرِنی سرخیٔ افسانۂ دل
اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا — دل کسی اور کا دیوانہ میں دیوانۂ دل

(روحِ شاعر سیلابِ نور میں سے آگے بڑھتی ہے اب اس کے سامنے ایک زریں تختہ بہتا ہوا آتا ہے۔ جس پہ ایک نازنیں بے ہوش پڑی ہوئی ہے۔ ہاتھ پانی کو چھوتے ہیں۔ اس کا لباس آئینوں اور تاروں سے بنا ہوا ہے جگہ جگہ سبز شعاعیں تیر کی نکلتی ہیں۔ اس کے پیچھے ایک ایک بے تاب پیکر بال پریشاں ہاتھ پیر مارتے ہوئے تختہ کو تھامنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر تختہ آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بے تاب پیکر پکارتا ہے)

بیتاب پیکر۔ گرمیٔ قلب و نظر جذب سے اب کام لے — اے مری دیوانگی اس کو ذرا تھام لے

ٹھوکریں کھاتی ہے گو میرے لیے کائنات
ہل نہیں سکتا کبھی عشق کا پائے ثبات

رقص میں لاتی ہے جب وقت کی گردش مجھے
ملتی ہے کونین میں قلب کی لرزش مجھے

شیشۂ عقل و خرد ساغرِ چشم و نظر
آئینہ زندگی، پردۂ شام و سحر

منزلِ امن و سکون محفلِ علم و عمل
مستیِ کون و مکاں، بزمِ ابد اور ازل

لذّتِ ایمان و دل، دولتِ شوق و وصال
بت کدۂ خوش نگاہ، میکدۂ لازوال

سب مری وحشت کے قید سب مرے ساغر میں ہیں
ساری ٹھوکریں ہیں سب ساری ٹھوکریں ہیں

گرمیِ قلب و نظر، جذب سے اب کام لے
اے مری دیوانگی اس کو ذرا تھام لے

(تختۂ نازنیں کو لیے بہتا ہوا چلا جا رہا ہے اور کہتا ہے)

نگاہِ شوق کو سیلابِ ناز لے کے چلا
صلائے عشق کو طوفان ساز لے کے چلا

رواں ہے حسنِ نظر نور کے سفینے پر
عروسِ ناز کو اک بے نیاز لے کے چلا

نظر عروس ہے اور عقل و دل خراب نظر
جو جستجو میں ہوا سرفراز لے کے چلا

جنوں کی دست درازی سے بچ گیا شاید
حسینِ جلوے کو آئینہ ساز لے کے چلا

(روح شاعر محو نظارہ ہو جاتی ہے۔ اوپر سے دو فرشتے چاند تارے اوڑھے ہوئے گذرتے ہیں۔ ایک فرشتہ گاتا ہے)

فرشتہ کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش

دو فرشتے. عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

(روح شاعر یہاں سے گذر کر ایسے مقام میں آتی ہے جہاں رنگ و بو کا ایک طوفان برپا ہے۔ خوشبو مجسم معلوم ہوتی ہے۔ رنگ کی دیواریں کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس طوفان سے دو خوبصورت پھول رقص کرتے ہوئے گذرتے ہیں)

پھول۔ ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ساون کے جھولے
وہ حوروں کے قدموں سے گلزار پھولے
ملی ننھی کلیوں کو اک خوش نگاہی

وہ کوئل پکاری ۔ الٰہی ۔ الٰہی

بہاروں کی مستی نگاہوں کی دولت

مبارک سلامت مبارک سلامت

جوانی کی ٹھوکر میں چاند اور تارے

کنواری صداؤں سے کوئی پکارے

وہ زریں کمر لڑکیاں کھلکھلائیں

وہ ہنس ہنس کے جھولے کی پینگیں بڑھائیں

بہاروں کی مستی نگاہوں کی دولت

مبارک سلامت مبارک سلامت

ہر اک بھولی صورت وحی زندگی کی

ہر اک پاک مورت کلی زندگی کی

وہ رنگیں ادائیں متاع جوانی

وہ بھولی صدائیں مئے لن ترانی

بہاروں کی مستی نگاہوں کی دولت

مبارک سلامت ، مبارک سلامت

(ان کے پیچھے ننھی سی قوس قزح ہاتھ میں لیے اور ہاتھ سر پر بلند کیے ہوئے شبنمی پریاں رنگین قبائیں پہنے ہوئے گذرتی ہیں اور گاتی ہیں)

رنگ اور بو کے دریا جاگے دوڑے تارے آگے آگے

بادل بادل رنگت چھائی جوگن بن کر قدرت آئی

آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں

آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں

اس نگری میں پیت بھری ہے ڈالی ڈالی دل کی ہری ہے

اپنے آگے نور کا پردہ　　اللہ اللہ　　اللہ اللہ

آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں

آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں

(سامنے سے حضرت جبرئیلؑ اڑتے ہیں۔ ان کے پروں کی ہوا سے سیارے تنکوں کی طرح دور ہو جاتے اور فضا ایک نیلگوں نور بن کر رہ جاتی ہے۔ روح اقبال گنگناتی ہوئی گذرتی ہے)

سینہ کشادہ جبرئیلؑ از بر عاشقاں گذشت　　تا شررے بہ او فتد ز آتش آرزوئے تو
ہم بہ ہوائے جلوۂ پارہ کنم حجاب را　　ہم بہ نگاہِ نارسا پردہ کشم ز روئے تو

(روح شاعر، اقبال کے پیچھے رواں ہوتی ہے۔ وہ حیرت کے ساتھ بلند اور نیلگوں فضا کی طرف دیکھتی ہے جس کی رنگینی وسعت اس کی بلندی کو پوری شان کے ساتھ ظاہر کر رہی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ کروڑہا میل اوپر گہری فضا میں فرشتوں کا رقص ہو رہا ہے۔ حلقوں کے حلقے ہاتھ میں ہاتھ ملائے اُڑ رہے ہیں۔ ان کے سامنے رنگین ستاروں کی جھلک نظر آتی ہے۔ فضائے نیلگوں سے روح اقبال آواز دیتی ہے)

بیا کہ[1] خاوریاں نقش تازہ بستند　　دگر مرو بطواف بتے کہ بشکستند
چہ جلوۂ الست کہ دلہا بہ لذت نگہے　　ز خاک راہ مثال شرارہ برجستند
تو ہم بہ ذوق خودی رس کہ صاحبان طریق　　بریدہ از ہمہ عالم بہ خویش پیوستند
غلام ہمت بیدار آں سوار انم　　ستارہ را بہ سناں سفتہ در گرہ بستند

(روح شاعر چاروں طرف دیکھتی ہے اور فکر میں ڈوب جاتی ہے)

روح شاعر۔ یہ تماشائے نظارہ یہ تجلی کا ہجوم　　نیلگوں وسعت افلاک میں یہ رقص نجوم
یہ ملائک کی سر چرخ منور پرواز　　حور و غلمان کی سراپردۂ جاں سے آواز
اخضریں بحر میں یہ نور کا سیلاب رواں　　کشتی حسن میں بیٹھی ہوئی حوران جناں
اور اس اوج نظارہ پہ مرا ذوق سفر　　ہر قدم پر دل بے تاب کو اک خوف و خطر

---

[1] زبور عجم صہ ۱۵۲

نامۂ شوق ہے کیا محفلِ ہستی کے لیے   ساغرِ عشق ہے کیا حسن پرستی کے لیے
کیا مجھے منزلِ آخر کا پتہ ملتا ہے   کیا مجھے وادیٔ حیرت میں خدا ملتا ہے

(سامنے سے دو فرشتے یہ گاتے ہوئے گذرتے ہیں)

ایک فرشتہ۔ "ایں دل کہ مرادا دی لبریزِ یقیں بادا   ایں جام جہاں بینم روشن تر ازیں بادا"
دوسرا فرشتہ۔ "جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا   تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا"

(یہ گا کر فرشتے نیلگوں بلندی کی طرف اڑ جاتے ہیں۔ روحِ شاعر اب ایسے مقام پہ پہنچتی ہے جہاں اسے ایک قدم آگے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ مقام نہایت بلند ہے اور آگے عدم کی طرح عظیم الشان خلا ہے۔ سوائے اڑنے کے چارہ نہیں۔ روحِ شاعر بہت گھبراتی ہے۔ ایک آواز آتی ہے)

یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہرِ یک دانہ   یک رنگی و آزادی اے ہمتِ مردانہ
یا حیرتِ فارابی یا تاب و تبِ رومی   یا فکرِ حکیمانہ یا جذبِ کلیمانہ

(روحِ شاعر اڑنے کے لیے کسی فرشتے کی مدد کی طالب ہوتی ہے پھر آواز آتی ہے)

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے   یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

(یہ سُن کر روحِ شاعر پر ایک وجد طاری ہوتا ہے۔ وہ بلند حوصلہ ہوتی ہے۔ لیکن ہمراز اور ساتھی کوئی نہیں۔ وہ ایک کش مکش میں پڑ جاتی ہے اور کہتی ہے)

آہ کیا بیگانگی ہے اس طلسمِ عرش کی   کوئی میری دستگیری کے لیے آتا نہیں
پائے ماندن ہے نہ جائے رفتن از طوفانِ شوق   جذبۂ توفیق بھی یاں ناز فرماتا نہیں

(فرشتوں کا ایک جھرمٹ گاتے ہوئے گذرتا ہے)

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے نا تمام ابھی   نقش گرِ ازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی
دانش و دین و علم و فن بندگیٔ ہوس تمام   عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہرِ زندگی ہے عشق جوہرِ عشق ہے خودی   آہ کہ ہے یہ تیغِ تیز پردگیٔ نیام ابھی

(روحِ شاعر دیکھتی ہے کہ پیچھے سے طناب نور کھینچ رہے ہیں اور اس کے کھڑے رہنے کا مقام تنگ ہو رہا ہے۔ وہ چیختی ہے اور کہتی ہے)

[1] اے خدائے مہر و مہ خاکِ پریشانے نگر — ذرۂ در خود فرو پیچد بیابانے نگر
حسنِ بے پایاں درونِ سینۂ خلوت گزید — آفتابِ خویش را زیرِ گریبانے نگر
بر دلِ آدم زدی عشقِ بلا انگیز را — آتشِ خود را بہ آغوشِ نیستانے نگر

(روحِ اقبال کی آواز آتی ہے)

دل زندہ و بیدار اگر ہے تو بتدریج — بندے کو عطا کرتے ہیں چشمِ نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہیں سب کچھ — ہر لحظہ ہیں سالک کے زماں اور مکاں اور

(روحِ شاعر پوچھتی ہے)

اے رہبرِ حیات میرے بال و پر کو دیکھ — معراجِ رنگ و نور پہ میری نظر کو دیکھ
جی چاہتا ہے قوتِ پرواز کے لیے — بے چین دل ہے گرمیٔ دمساز کے لیے
لیکن یہ عزم سوزِ تجلی خدا گواہ — گم کر رہی ہے ذوقِ نظر شوخیٔ نگاہ
اس اوجِ منتہی پہ رسائی ہو کس طرح — اور آشکار رازِ خدائی ہو کس طرح

(روحِ اقبال جواب دیتی ہے)

[2] می شود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے — دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے
وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے — طے شود جادۂ صد سالہ بہ آہے گاہے

(روحِ شاعر ایک آہ عارفانہ کھینچتی ہے جس سے اس میں قوتِ پرواز آ جاتی ہے اور وہ چشم زدن میں ستاروں سے آگے فضائے نیلگوں میں پہنچ جاتی ہے۔ قریب پہنچنے کے بعد اسے ایک بلند اور عظیم لوح پر شاندار حروف میں لکھا ہوا نظر آتا ہے "مقامِ عشق" روحِ اقبال ایک پردۂ رنگیں سے آواز دیتی ہے)

[3] تو اے اسیرِ مکاں لا مکاں سے دور نہیں — وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

---

[1] زبورِ عجم ص۸۶ [2] بالِ جبریل ص۳۰ [3] زبورِ عجم ص۳

وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں — غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں
وہاں تو کیا مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے — قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

(یہاں روح شاعر کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چل تو رہی ہے لیکن اس کے پاؤں کسی چیز سے نہیں چھوتے۔ جدھر نظر ڈالتی ہے اسے کوئی مقناطیسی قوت اپنی طرف کھینچتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ساری فضا کا رنگ نیلگوں ہے۔ دور بدور زمردیں درختوں کی چھاؤں میں زجاجی مینار۔ گنبد اور محل نظر آتے ہیں۔ فضا میں جو چیز اڑتی ہے دوہری نظر آتی ہے۔ ڈالی پر نوا فشاں طیور کے جوڑے چہچہاتے ہیں۔ روح شاعر کا یہاں اس طرح خیر مقدم ہوتا ہے)

مینار۔ وحدت کی صدائیں دیتا ہوں — الفت کی فضائیں دیتا ہوں
نیلی ہے قبا ایوانوں کی — آتی ہے صدا ارمانوں کی
ہر گام پہ زینہ نور کا ہے — ہر جلوہ برق طور کا ہے
جلتا ہے مرے سینے میں چراغ — تھامے ہوئے ہوں میں دل کا ایاغ
آ، اور یہ شمع عشق اٹھا — آ، حسن ازل کی آگ لگا

بلوریں گنبد۔ ہم یہاں چتر شادمانی ہیں — زینت فرق آسمانی ہیں
نقش رنگیں ہیں ان فضاؤں پہ — خواب زرشیریں ہیں ان ہواؤں پر
عشق مضطر کا دل لبھاتے ہیں — روشنی نظر بڑھاتے ہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی نگاہ میں کھو جا — چھاؤں میں رنگ و نور کی سو جا

طیور آسمانی اڑتے ہیں گاتے ہیں — برق دل چمکاتے ہیں
قدس جاں دکھلاتے ہیں — تکبیر برساتے ہیں
اللہ ہو ، اللہ ہو
رنگ و بو پلائے جا — جاں بن کر چھائے جا
اپنا دل بہلائے جا — مستی سے یہ گائے جا
اللہ ہو ، اللہ ہو ،

(روح شاعر کے سامنے ایک زرنگار تخت، مرصع درخت کی چھاؤں میں نظر آتا ہے۔ پتے جب ہلتے ہیں تو ان سے بہ یک وقت نغمۂ رنگا رنگ اور نسیم سحری کی موجیں نکلتی ہیں۔ روح شاعر تخت پر بیٹھ کر مستانی ہے اور اس کا دل بے اختیار گنگنانا چاہتا ہے)

روح شاعر۔ نغمہ کی چھاؤں نگہت بیدار کی ہوا
رنگوں کے قصر و بام سے آرائش فضا

تنہائی و سکوں میں شیریں لطافتیں
ہر جنبش نگاہ میں رنگیں نزاکتیں

دل جلوہ گاہ حسن میں مدہوش اعتبار
امید کی شعاع، تصور کا اختیار

ہر گام پر حیات نظر آزمائے شوق
ہر بات میں خیال ازل مبتلائے شوق

انوار کے ظروف میں رنگینیٔ خیال
الطاف کے رباب میں اک نغمۂ وصال

جذب و کشش سے خون جگر کھیلتا ہوا
ہنستے ہوئے فراق کا غم جھیلتا ہوا

کون و مکاں پگھلتے ہیں لیتے ہیں نام عشق
ہے کتنا دل گداز الٰہی مقام عشق

(روح شاعر یہ گنگناتے ہوئے سو جاتی ہے۔ مدتوں تک سوئے رہنے کے بعد جاگتی ہے تو عالم ہی کچھ اور ہے۔ سوائے تنہائی اور چند دور کے نغموں کے اور کچھ نہیں ہے۔ لحظہ بہ لحظہ روشنیاں تیز ہوتی جاتی ہیں۔ نور کے پردوں میں لپٹی ہوئی روح اقبال گاتی ہوئی گذرتی ہے)

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام[1]

عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

عشق فقیہہ حرم عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

(پھر آگے بڑھ کے)

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب

گاہ بہ حیلہ می برد، گاہ بہ زور می کشد
عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب

---

[1] بالِ جبریل ص ۱۲۷ و ص ۱۵۵۔ [2] پیام مشرق۔

(روح شاعر کہتی ہے)

دلِ مایوس کا امید بھی غم کھائے گی　　اس سفر کی کوئی منزل بھی نظر آئے گی

(آواز آتی ہے)

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب　　آخر کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب اخر

(روح شاعر نظر اوپر اٹھاتی ہے اور عالم محویت میں کہتی ہے)

جذبہ، روئے خود کشی پردہ صبح و شام را　　چہرہ کشا تمام کن جلوۂ نا تمام را

(اس وقت ہجوم تجلی سوگنا تیز ہو جاتی ہے۔ نور کی چادریں سیلاب در سیلاب آنے لگتی ہے۔ روح شاعر اپنی آنکھوں کو خیرہ ہوتی ہوئی دیکھتی ہے۔ یکایک چاروں طرف سے ایک علم لہراتا ہوا گذرتا ہے۔ جس پر لکھا ہوا ہوتا ہے)

سطوت[1] از کوہ ستانند و بہ کاہے بخشند　　کلۂ جم بہ گدائے سر راہے بخشند

گاہ شاہی بہ جگر گوشۂ سلطان ندہند　　گاہ باشد کہ بہ زندانی چاہے بخشند

(اس طوفانِ تجلی سے ایک بڑا فرشتہ نکل آتا ہے۔ جس کے پروں پر سیارے ناچتے ہیں وہ کہتا ہے)

مرکب عشق ہوں انوار کے پر رکھتا ہوں　　سطوت کون و مکاں زیر و زبر رکھتا ہوں

مرحبا تجھ کو ملا ذوق یقیں، لذت عشق　　دیکھ آئینۂ کونین میں اب شوکت عشق

سوز و ساز و نظر و لذت دیدار جگا　　نگہ عشق کی اب چشم طلب گار جگا

پاک کرتا ہے شعاع نگہہ حسن طلب　　جان آلودہ کو دھو، گود میں لے بخشش رب

گرم کر محفل دل سوز تجلی کی طرح　　مست ہو لذت آواز تسلی کی طرح

حوصلہ ہے تو یقین کی نگہ پاک سے دیکھ　　جلوۂ عشق کو اپنے دل بے باک سے دیکھ

تیری آہ دل مضطر میں اثر آئے گا　　جلوہ شاید تجھے رحمت کا نظر آئے گا

(یہ کہہ کر فرشتہ روح شاعر کو لے اڑتا ہے۔ دونوں شفق سے بھی زیادہ رنگین بادلوں سے گذرتے ہیں۔ پھر وہ روح کو ایک بہت بڑے ایوان میں چھوڑ دیتا ہے۔ ایک طرف ستاروں کی طرح جھاڑ اور دوسری طرف چاند کا فانوس آویزاں ہے۔ روح اقبال ایک مصلے پر بیٹھی ہوئی گا رہی ہے)

---

[1] پیام مشرق۔

من بندۂ آزادم عشق است امام من　　　عشق است امام من عقل است غلام من
جاں در عدم آسودہ بے ذوق تمنا بود　　　مستانہ نوا ہا زد در حلقۂ دام من
اے عالم رنگ و بو ایں صحبت ما تا چند　　　مرگ است دوام تو عشق است دوام من
پیدا بہ ضمیرم او، پنہاں بہ ضمیرم او　　　ایں است مقام او، دریاب مقام من

یہاں روح شاعر جدھر نظر ڈالتی ہے دیواروں میں تجلیوں کے آئینے نصب کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ روح شاعر جب ان کے سامنے جاتی ہے تو ان میں اپنا عکس نظر نہیں آتا تجلی الٹ کر اس کے منہ پہ نور لگاتی ہے۔ روح شاعر کہتی ہے)

بر جہان دل من تاختنش را نگرید　　　کشتن و سوختن و ساختنش را نگرید
روشن از پرتو آں نور رخ کیست کہ نیست　　　باہزار آئینہ پرداختنش را نگرید

(ایوانِ تجلی میں اب نور کے اتنے سیلاب آنے لگتے ہیں کہ روح شاعر اپنے آپ کو اس میں بہتی ہوئی پاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں آفتاب ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ ایوان کے چاروں طرف دیکھتی ہے لیکن راستہ نظر نہیں آتا۔ ایوان کہتا ہے)

عشق میں نور کا غبار　　　عشق میں نور کا فشار
عشق میں نور کا حصار　　　عشق میں نور کا منار
حیرت صد نگاہ ہے، حیرت صد نگاہ ہے

ظرف نہیں تو دید کیا　　　گوش نہیں شنید کیا
رنج نہیں نوید کیا　　　سوز نہیں اُمید کیا
ہیچ یہ جلوہ گاہ ہے، ہیچ یہ جلوہ گاہ ہے

سوز یقیں جگا ابھی　　　دردِ جگر بڑھا ابھی
عشق کو جگمگا ابھی　　　حسن کے گیت گا ابھی
یاں کی یہ رسم و راہ ہے، یاں کی یہ رسم و راہ ہے

دید سے ہے بلند حسن　　　عشق کی ہے کمند حسن

سر دیہاں نگاہ ہے، سر دیہاں نگاہ ہے

(اس وقت نور کی ایسی موجیں اُٹھتی ہیں کہ ایوانِ تجلّی اور روحِ شاعر دونوں اس میں بہہ جاتے ہیں۔ بے انتہا مسافت طے کرنے کے بعد روحِ شاعر ایک بلند مینار سے ٹکراتی ہے۔ جب روحِ شاعر سنبھل کر مینار پر نظر ڈالتی ہے تو اس کا کلس نگاہ نگاہ کے ساتھ ساتھ بلند ہوتا ہے حتیٰ کہ نیلگوں رواق سے بھی گذر جاتا ہے۔ روحِ شاعر اس مینار پر چڑھ جاتی ہے۔ نور کا طوفان نیچے ٹکراتا ہے۔ چڑھتے ہی وہ اطراف کی فضا کو دیکھتی ہے جہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معشوقِ ازل اس کی طرف آرہا ہے۔ یہ مقامِ امید ہے۔ روحِ شاعر امید کی ترنگ میں معشوقِ ازل کی آمد کا تصور کرکے گاتی ہے)

نہ تو اندر حرم گنجی نہ در بت خانہ می آئی　　　　ولیکن سوئے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی

قدم بیباک تر نہ در حریمِ جانِ مشتاقاں　　　　تو صاحب خانۂ آخر چرا دزدانہ می آئی

(مینار کے کلس پر جلوۂ ربانی کوندنے لگتا ہے اور روحِ شاعر یہ دیکھتی ہے کہ چاروں طرف ایک چکا چوند کرنے والا عکس دوسرے پر پڑتا ہے۔ اس طرح برق در برق جلوہ در جلوہ پیدا ہو رہا ہے۔ روحِ شاعر کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ آنکھ بند کرکے جھومنے لگتی ہے اور کہتی ہے)

از چشم ساقی مست شرابم　　　　بے مے خرابم بے مے خرابم

شوقم فزوں تر از بے حجابی　　　　بینم نہ بینم در پیچ و تابم

از من بروں نیست منزل گہ من　　　　من بد نصیبم راہے نیابم

(اب اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مینار اور روحِ شاعر دونوں گھماتے جارہے ہیں۔ اس چکر میں وہ عرش کے نیچے ایک ایسے ازلی میدان میں آنکھ کھولتی ہے۔ جہاں فرشِ شعاعی اور وسعتِ لامتناہی کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ بہت دور نور کی ایک لکیر بے یقینی اور عشق کے پیکر ستاروں کے ساتھ ساتھ گذرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ روحِ شاعر یہ کہتی ہوئی بے ہوش ہو جاتی ہے)

مارا ز مقام با خبر کن　　　　مائیم کجا و تو کجائی ؟

(پردہ)

لہ زبورِ عجم صفحہ ۵۵

اقبال اکیڈیمی کی مطبوعات

۱۔ شکوہ اور جواب شکوہ منظوم انگریزی ترجمہ نواب سید محمود علی خاں ٹائرڈ

۲۔ اقبالیاتِ ماجد اقبالیات پر مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریریں

قیمت ۸ روپے

۳۔ اقبال کا ذہنی سفر یومِ اقبال ۱۹۷۶ء میں پیش کیے گئے مقالات

قیمت ۴ روپے پچاس پیسے

۴۔ تھری آرٹیکلس آف اقبال (انگریزی) اقبال کے تین کمیاب مضامین

قیمت ۵ روپے

ملنے کا پتہ:

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد، مدینہ منشن نارائن گوڑہ، آندھرا پردیش ۵۰۰۰۲۹